اگست
۲۰۱۱ء

اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۲۴، شمارہ ۸ اگست ۲۰۱۱ء / رمضان ۱۴۳۲ھ

مشمولات

ہم حمایت کرتے ہیں	مدیر	۲
O ہمارا تعلیمی تناظر		
وحدت نظام تعلیم	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	۳
نئے انداز کے دینی مدارس کی ضرورت	ڈاکٹر محمد امین	۱۳
پاکستان کی اہم دینی جامعات دارالعلوم کراچی کا تعارف	ادارہ	۱۸
O پاکستانیات		
پاکستان توڑنے کی امریکی سازشیں	ملک احمد سرور	۲۸
O تفہیم مغرب		
مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج (۲) ٹیکنالوجی کی بحث	ڈاکٹر عبدالوہاب سوری	۳۲
O تزکیۂ نفس		
روزہ۔ تزکیۂ نفس کا مؤثر ذریعہ	امام ابن قیمؒ	۴۵
O ہماری سرگرمیاں		
دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس مختصر روداد	اسد محمود کاشمیری سراج محمود ناصر	۴۷
O تعارف کتاب	انجنیئر مختار فاروقی	۵۳
O مدیر کے نام	ادارہ	۵۴
O تالیفاتِ مدیر	ادارہ	۵۶

ہم حمایت کرتے ہیں

امت مسلمہ زوال سے نکلنے کی جدوجہد کررہی ہے۔منزل سب کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں دینی احکام پر عمل اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔اسے آپ اسلامی نظام کہہ لیجیے، نفاذ شریعت کہیے، اسلامی انقلاب کا نام دیجیے یا بحالیٔ خلافت و نظام مصطفی کہیے، بات ایک ہی ہے۔اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے لوگ مختلف طریقوں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔کوئی دعوت دین میں مصروف ہے تو کوئی فرد کی اصلاح کے لیے کوشاں ہے۔کوئی سیاسی جدوجہد کررہا ہے تو کوئی تعلیمی میدان میں مشغول ہے اور کوئی کفار کا غلبہ اپنے معاشرے سے ختم کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کررہا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ ساری کوششیں محمود ہیں۔ان کے کرنے والے قابل مبارکباد اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔یہ کم نظری ہوگی کہ یہ آپس میں الجھیں اور ایک دوسرے سے کہے کہ تم غلط ہو اور دوسرا تیسرے سے کہے کہ تمہارا منہج درست نہیں ہے اور ہر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ صرف اس کا منہج ہی درست ہے اور حق اس کے مؤقف میں منحصر ہے؛ کیونکہ کسی پر وحی نازل نہیں ہوتی اور نہ کوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح معصوم ہے۔اجتہادی رائے ٹھیک بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی اور اخلاص کے ساتھ اگر غلط بھی ہو تو قابل ثواب ہے۔لہٰذا ہمارا مؤقف یہ ہے کہ یہ سارے منہج درست ہیں۔یہ سب لوگ اس وقت تک صحیح ہیں جب تک وہ اپنی منزل کے بارے میں یکسو ہیں اور اس کی طرف پیش قدمی کررہے ہیں۔طریق کار کا اختلاف بے معنی ہے بلکہ ہمیں کہنے دیجیے کہ یہ رحمت ہے کہ اس میں وسعت ہے، اس میں لوگوں کی صلاحیتوں اور مزاجوں کا لحاظ ہے۔جو لڑ نہیں سکتا وہ پڑھا تو سکتا ہے اور جو معلم نہیں ہے وہ داعی تو بن سکتا ہے اور جو کچھ نہیں کرسکتا وہ شریعت پر عمل تو کرسکتا ہے **وقس علی ذلک۔**

لہٰذا ہم ان سب کی حمایت کرتے ہیں۔ان کی بھی جو جہاد کررہے ہیں، ان کی بھی جو تعلیم دے رہے ہیں، ان کی بھی جو دعوت دین میں مصروف ہیں اور ان کی بھی جو سیاسی جدوجہد کررہے ہیں اور ان کی بھی جو فرد کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں۔اے دین کی راہ پر چلنے والو! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو، تمہاری کوششوں میں برکت دے اور تمہیں کامیابی سے ہم کنار کرے۔

ہاں! ہم حمایت نہیں کرتے ان کی جو اللہ کی نافرمانی پر دلیر ہیں، جو شیطان کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں، جو نفس کے غلام اور دنیا کے بندے بننے پر راضی ہیں یا جو کفار کے گماشتے ہیں، ان سے مرعوب ہیں اور ان کے راستے پر چلنے میں عافیت اور کامیابی محسوس کرتے ہیں۔مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یہ مضمون خلاصہ اور ضمیمہ ہے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی معرکۃ الآراء کتاب 'برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' کا چنانچہ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''منجملہ دیگر اہم مقاصد کے جو اس کتاب کے لکھنے میں مصنف کے پیش نظر تھے، بڑا مقصد 'نظام تعلیم کی وحدت' کے نظریہ کو پیش کرنا تھا، خدا کا شکر ہے کہ بعض ممتاز مفکرین اور ارباب سعی و عمل نے اس کو مستحق توجہ قرار دیا ہے بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی نے خصوصیت کے ساتھ مختصر لفظوں میں خاکسار مصنف سے چاہا کہ اس 'تعلیمی خاکے' کو مرتب کر کے اُن کی خدمت میں پیش کروں۔ سید صاحب موصوف نے 'معارف' ماہ جولائی ۱۹۴۵ء میں شذرات کے تعارفی نوٹ کے ساتھ اس خلاصے کو شائع بھی کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی اس جلد کے ساتھ اس خلاصہ کو بھی ضمیمہ بنا دیا جائے۔''

یہ مضمون پڑھ کر ہمیں حوصلہ ہوا کہ پچھلی ربع صدی سے ثنویت کے خاتمے کی جو اذان ہم صحرا میں دے رہے ہیں تو اس میں ہمیں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسی ہستی کی متابعت کا شرف حاصل ہے۔ کاش ہمارے علماء کرام دینی مدارس کے نظام تعلیم پر نظر ثانی فرمائیں اور مولانا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ امین

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

نظام تعلیم کی وحدت

مسلمانان ہند کی تعلیمی مشکلات ہی کا حل میری کتاب نظام تعلیم تربیت میں پیش کیا گیا ہے جو سالہا سال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے۔ چونکہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی ہے اس لیے اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کی آبیاری کرتے ہوئے مسلمان کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں؟ میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سر دست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کروں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے، وہ کیا ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہو جانے کے بعد حکومت مسلطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے قائم کیا، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بُعد پیدا ہوتا چلا جا رہا

ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے، ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں۔ یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا تھا، لیکن وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو، وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے! یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہوا تو یہ تعداد یوں ہی اور بڑھتی چلی جائے گی۔

۲۔ حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظورہ کردہ نصاب کی تعلیم لازماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہوکر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

۳۔ مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہنچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے بعد ممکن ہے، لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بے چین ہیں۔ خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں، یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں ان سے بحث میں طوالت ہوگی۔ اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب تعلیم وتربیت میں مَیں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے

کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومتِ مُسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہوگئے ہیں اس کی دوئی اور ثنویت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کرلیا جائے۔ اسی لیے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے 'وحدت نظام تعلیم' رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومت مسلطہ سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو نظام بظاہر قائم تھا عام طور پر 'درس نظامیہ' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہوگئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم ونثر وانشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب، خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے)، حدیث کے متعلق مشکوٰۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بہ ظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا یعنی شرح دقایہ اور ہدایہ لیکن ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا جو شرح وقایہ میں پڑھائے جاتے تھے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حکماً وعملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے خیر آبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جزو نصاب تھا لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلباء جو کچھ پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورۂ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفۂ ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا یعنی علم کلام اور علم اصول فقہ، معانی و بیان وغیرہ۔ ان ہی علوم وفنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا

ضروری تھا جن میں صرف منطق وفلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرزِ عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج کل بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہوچکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے، اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہوکر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجوایٹ ہوگا اور ہر گریجوایٹ عالم۔ ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا۔ عالم وتعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہوجائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے ''نظریۂ وحدت نظام تعلیم'' کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً زبان

کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی اسی پچاسی فیصد الفاظ اس حصے کے اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے، البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت وعہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات ومعامرات وانشاء خالص ادبی نثر ونظم کی کتابیں ہیں یقینا دشوار ہے لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کرسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر و اختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے۔ میری گفتگو صرف عام لزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت ومناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت ومناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر واختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقینا ضرورت پڑے گی، جیسے دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے وہی طرز عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کرسکتے ہیں بلکہ طبعاً اختیار کرنا چاہیے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر ونظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا، پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو تو کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینا مناسب ہوگا، علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گونہ تعلق بھی ہے خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح وتوضیح کے لیے ایجاد کیا تھا مثلاً اصول فقہ، کلام یا بیان ومعانی وبدیع وغیرہ کا جو حال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا۔ کچھ لوگوں کا پڑھنا، پڑھانا ان کی بقاء اور ارتقاء کے لیے کافی ہے۔ بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا خیال ہے کہ ان کو وہی اختیاری مضامین میں شریک کرکے زندہ رکھا جائے لیکن ہر

مسلمان کو میلان باقی رکھنے کے لیے خصوصاً موجودہ حالت میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کردینے کے بعد اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائے گی؟ کیا ان کو جو ماحول میسر ہے، اس کے رسمی اثرات کے ازالہ کے لیے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلاشبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل، زہرہ گداز اور حوصلہ شکن سوال ہے۔ ماحول حکومت کے نقطۂ نظر کا تابع ہوتا ہے، جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر وعزت کی توقع غلط توقع ہے لیکن پھر کیا کیا جائے؟ کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو۔ اس کے ساتھ طبائع بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے، اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخر ان کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے؟ ہوسکتا ہے کہ قرآن کی پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے۔ سب کو نہیں تو بعض کو تو ان شاء اللہ ضرور متاثر کر کے رہے گی اور ان بعض کا اثر ان شاء اللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگر اور لے لیں، یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کیے جائیں، اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے گا۔ تو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جامعات اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو نہیں پاسکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کردیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں۔ جدید علوم و

فنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لیے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کیے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں جیسے کرتے ہوں۔ بحمداللہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہوچکی ہے تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے غیر اقوام کے اہل تقرر کر کے ہم خود اپنے ہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے نکل کر خود ہمارے قدیم علوم وفنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے، اس کا پیش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اِس وقت کیا جاتا ہے۔ پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خط نستعلیق ☆ سے بھی ان کو آشنا کیا جائے یعنی اردو پڑھائی جائے اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہوچکی ہے، اور آئندہ اردو کو چھوڑ کر فارسی کے آمد نامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے یہی عربی پڑھتے ہوئے بی۔اے تک پہنچے گی اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلاثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کو پڑھانا ہوگا۔

میری تجویز کا یہ اجمالی خاکہ ہے رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا ہے، البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں اگر عرض کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا:

☆ نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لیے نسخ کے حروف کو اردو کے لیے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر یہ مسئلہ طے ہوگیا تو پھر اس کی بھی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے، یہی طرز عمل ہم بھی اختیار کریں گے، نسخ طباعت کے لیے اور نستعلیق کتابت کے لیے۔

۱۔ تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچنا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعۂ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کرلینی چاہئیں جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے مَیں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیے لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو تعین کرنا ہے یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث وفقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر خیال ہو کہ کتاب کے ذریعے سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقے کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

۲۔ میرا خیال ہے کہ وحدت تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کرلیا جائے تو عربی کے عام مدارس جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے اس میں شک کی بہ ظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، تو یوں سمجھیے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کررہے ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کرچکی ہے۔ کلاسیکل زبانوں کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے، جس میں اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کش مکش کے بآسانی حل کرسکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لیے ضرورت ہے فارسی سے مناسبت پیدا کرانے کی اور فارسی میں قوت وہی حاصل کرسکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی، اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری پڑھانے سے زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی کے بعد عربی

سے طلباء کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔ یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگرو بے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علوم جدیدہ خصوصاً سائنس و کیمیاء وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی کیا ممکن ہے؟ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کردیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم وفنون کی تعلیم کا نظم کررکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ انگریزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لیے بنالیا جائے۔ اور اسلامی علوم کی تکمیل تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سیکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع، ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم کو قبول کرلینے کے بعد حکومت کا محکمۂ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چندوں سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔ علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گزرے گا۔ باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی۔ لیکن کیا کروں ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی

کتاب میں مَیں نے کافی بحث کی ہے اور بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے، روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی، اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہورہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لیے پیدا ہوجائیں کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے، بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے (لا فعلہ اللہ) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیے اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جارہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے، اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کر سکے۔ جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہوجائے گی۔ یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن و حدیث سے واقف بنانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینے کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے، ظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے لیکن بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے، تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی وصحت کے نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں اور اسی لیے **ہر چہ گیرد علّتی علت شود** کا خطرہ نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کرلے لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے ان شاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی ان شاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب او رمذہبی تعلیم کی عمومیت سے گریز

میرے نزدیک تو برہمنیت ہے۔ اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اس کی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہو، اس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کردیں وہ اپنے آخری دین کی بہرحال حفاظت فرمائے گا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

وہ علم نہیں زہر ہے اَحرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کفِ جَو

اقبالؒ

ڈاکٹر محمد امین

نئے انداز کے دینی مدارس کی ضرورت

پاکستان کے موجودہ دینی مدارس دراصل دینی تعلیم کے اس رول ماڈل ہی کی ایک توسیع ہیں جو بعض علماء کرام نے انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے خاتمے کے بعد ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں قائم کیا تھا تاکہ مسلمانوں کی مساجد آباد رہ سکیں اور ان کے عائلی قوانین (جیسے نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) اور خوشی وغم کی سماجی رسوم میں دینی احکام پر عمل جاری رہ سکے۔ علماء کرام نے انتہائی کس مپرسی کے عالم میں جب مقتدر انگریز حکومت ان کی مخالف تھی اور مسلم معاشرہ ہر لحاظ سے زبوں حالی کا شکار تھا، ایثار وقربانی کی شاندار روایات قائم کرتے ہوئے ان مدارس کو جاری رکھا اور وہ ان مقاصد واہداف کو پانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے جو اِن مدارس کے قیام کے وقت ان کے پیش نظر تھے۔

ہم یہ بات بھی اس تحریر کے آغاز ہی میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم دینی مدارس کے بہی خواہ اور ان کے ہمدرد ہیں لہٰذا اس مضمون سے مقصود مدارس پر بے جا تنقید، ان کی مخالفت اور ان کا استخفاف و ہوا خیزی نہیں بلکہ اگر ہم ان کے کردار میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمیں ان سے ہمدردی اور محبت ہے۔ ہم ان کے خیر خواہ ہیں اور مسلم معاشرے و ریاست میں ان کا کردار زیادہ وسیع، زیادہ مفید اور زیادہ مؤثر دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں بلکہ شریعت تو کہتے ہی ان ہدایات اور تعلیمات کو ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے دی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا نظام تعلیم شروع ہی سے موحد (Integrated) اور ایک رہا ہے اور انہی مدارس میں، جو دین کے علماء پیدا کرتے تھے اور انہیں علماء ہی چلاتے تھے، دینی علوم کے علاوہ ہر قسم کے عمرانی اور سائنسی علوم بھی (جیسے طب، ہیئت، ہندسہ، حساب، فلسفہ، منطق، ادب، السنہ، قانون وغیرہ) بھی پڑھائے جاتے تھے اور ایسا فرد تیار کیا جاتا تھا جو معاشرے اور ریاست کا مفید کارکن ہوتا تھا یعنی جو لوگ ان مدارس سے فارغ ہوتے تھے وہ تجارت اور کاروبار کرتے تھے، ہنرمند (Skilled)، پیشہ ور (Professionals) اور آزاد پیشہ (Self Employed) ہوتے تھے جیسے نجار، حداد، طبیب وغیرہ اور بعض مسلم ریاست میں بطور قاضی (جج)، مفتی (ایڈووکیٹ)، منتظم (کلیکٹر)، کاتب (کلرک) اور فوجی وغیرہ ملازمت کر لیتے تھے۔ خود وہ نصاب جسے ملا نظام الدین سہالویؒ کی نسبت سے درس نظامی کہا جاتا ہے ایسا ہی جامع نصاب تھا جو معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن تیار کرتا تھا اور صرف مساجد و مدارس کے لیے علماء ہی تیار نہیں کرتا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا دینی علوم کا نصاب بہت ہلکا تھا (علوم القرآن میں صرف جلالین اور بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ پڑھائے جاتے تھے) اور باقی سارے علوم (فلسفہ و حکمت، منطق، ریاضی، فقہ و اصول فقہ، کلام، صرف ونحو اور بلاغت وغیرہ) وہ تھے جو مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے مفید شہری اور کارکن تیار کرتے تھے۔

یہ بات اتنی معروف تھی کہ دیوبند بنتے ہی اس کے بانی حضرات مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے علی گڑھ (جو مسلمانوں کی دنیاوی تعلیم کا ادارہ تھا) سے رابطہ کیا اور طلبہ کے

تبادلے(Student Exchange) کا منصوبہ تیار کیا تاکہ دیوبند کے طلبہ دنیاوی علوم بھی حاصل کیا کریں۔بعض وجوہ سے اس پر عمل نہ ہوسکا لیکن اس کا خیال کبھی علماء دیوبند کے ذہنوں سے گیا نہیں چنانچہ جامعہ ملیہ کی بنیادرکھنے والے خود شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے جو دیوبند کے سربراہ تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نظام تعلیم کی وحدت کا نعرہ پورے زور سے لگایا(ان کی کتاب 'برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت' اسی موضوع پر ہے) اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کے مضمون کو اہتمام سے 'معارف' میں طبع کیا۔مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دیوبند کے نصاب میں تبدیلی اورخصوصاً انگریزی کی تدریس کی حمایت کی اورسلہٹ کے مدارس کے لیے نیا نصاب بھی تیار کیا لیکن تاریخ کا جبر یہ ہے کہ ان ساری کوششوں کے باوجود دیوبند اور علی گڑھ کے دونوں رول ماڈل اپنے اپنے ڈھرے پہ چلتے رہے اور نظام تعلیم کی وحدت کا خواب خواب ہی رہا اور نہ وہ ندوہ میں پورا ہوا اور نہ جامعہ ملیہ میں۔قیام پاکستان کے بعد چونکہ حکمرانوں کے رویوں میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ انہوں نے تعلیم کی اصلاح کی کوئی کوشش کی لہٰذا علماء کرام بھی پرانے ڈھب پر دینی مدارس چلاتے رہے اور آج بھی چلائے جارہے ہیں۔امریکہ اور مغرب کی طرف سے دینی مدارس کی مخالفت نے اور گماشتہ مقامی حکمرانوں کے ذریعے مدارس میں مداخلت نے دینی مدارس کو ردعمل میں حفاظت خود اختیاری کے جذبے کے تحت اپنے اندر سمٹنے اور بیرونی اثرات قبول نہ کرنے کے رجحان میں مزید سختی پیدا کی۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں دینی مدارس ہماری اور ہم جیسے دوسرے مخلصین کی اصلاحی تجاویز پر غور کرنے کو تیار نہیں اور نہ اپنے اندر عصری ضرورتوں اور وحدت تعلیم کے حوالے سے کوئی تبدیلی لانے کو تیار ہیں۔یہ تعلیمی صورت حال چونکہ امت اور مسلم معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے اب اہل درد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ موجودہ دینی مدارس کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے لیکن اس پر تکیہ کرنے کی بجائے مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسلاف کی طرز پر وحدت تعلیم کے تصور کے مطابق نئے انداز کے دینی مدارس قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

فرق: نئے مجوزہ دینی مدارس، موجودہ دینی مدارس سے کس طرح مختلف ہوں گے اس کا اندازہ ذیل کے جدول سے کیجیے:

موجودہ دینی مدارس	نئے مجوزہ دینی مدارس

۱۔ یہ عوام کی محدود مذہبی ضروریات پوری کرتے ہیں اور جیسے مساجد اور مدارس کی آبادی اور مذہبی رسوم پر عمل۔	۱۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں معاشرے ریاست کی مفید کارکن بن سکیں گے۔
۲۔ مساجد اور مدارس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ روزگار میسر نہیں	۲۔ پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر میں ہر جگہ کام کر سکیں گے۔
۳۔ یہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت پر مبنی ہیں	۳۔ یہ مسلک پرستی سے بالاتر رہتے ہوئے کام کریں گے۔
۴۔ عام شہری زندگی (Mainstream life) سے کٹے ہوئے	۴۔ عام لوگوں جیسی شہری زندگی بسر کرنے والے
۵۔ جدید مسائل میں عوام کی رہنمائی سے عاجز	۵۔ جدید مسائل میں عوام کی رہنمائی کے قابل
۶۔ دینی تعلیم کی غیر منظور شدہ ڈگریاں	۶۔ حکومتی منظور شدہ ڈگریاں
۷۔ عصری علوم کی تفہیم و تدریس کے مواقع نہ ہونا	۷۔ عصری علوم کی تفہیم و تدریس کا انتظام
۸۔ دینی علوم کا جامد نصاب جس میں عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام نہیں	۸۔ دینی علوم کا updated نصاب جو عصری ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔

نصاب: مجوزہ نئے مدارس کا نصاب و نظام کچھ اس طرح ہوگا:

۱۔ مڈل پاس بچوں کو داخلہ دیا جائے گا ۲۔ تعلیمی ادارہ دن بھر کا ہوگا ۳۔ طلبہ ۶ سال میں عالیہ/ بی اے کریں گے۔

۴۔ عالیہ/ بی اے کے دو سالوں میں طالب علم ایک مضمون وہ بھی پڑھے گا جس میں اس نے ایم اے کرنا ہے۔

۵۔ طلبہ علوم اسلامیہ کے علاوہ عمرانی علوم (سوشل سائنسز) کے کسی دوسرے مضمون میں بھی ایم اے کر سکیں گے جیسے معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ، صحافت اور انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانیں ۔۔۔وغیرہ۔

۶۔ طلبہ کا داخلہ اور اساتذہ کی تقرری بلالحاظ مسلک ہوگی۔

۷۔ دینی علوم اور عصری مضامین الگ الگ اور موجودہ شکل میں نہیں پڑھائے جائیں گے بلکہ نصاب ایک ہی ہوگا اور عصری مضامین بھی اسلامی تناظر میں مدون کیے جائیں گے۔

۸۔ موجودہ دینی نصابات پر باسلوب ذیل نظر ثانی کی جائے گی:

i۔ عربی زبان اس طرح پڑھائی جائے گی کہ اس میں ساری مہارتیں حاصل ہوجائیں

ii۔ قرآن حکیم کا نصاب میں زیادہ حصہ۔قدیم وجدید تفسیروں کا مطالعہ

iii۔ حدیث: آخری سال دورہ کی بجائے حدیث کا تحقیقی وعلمی مطالعہ

iv۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اضافہ

v۔ اصول فقہ کا تقابلی مطالعہ اور جدید اصول قانون کی تدریس

vi۔ فقہ وقانون کا تقابلی مطالعہ: اسلامی مذاہب میں نیز پاکستانی ،مغربی اور بین الاقوامی قوانین کا منتخب مطالعہ۔اجتہاد اور جدید مسائل

vii۔ امت کی تاریخ اور جغرافیہ

viii۔ عمرانی علوم کا اسلامی اور تقابلی مطالعہ یعنی معاشیات، سیاسیات، فلسفہ۔۔۔وغیرہ کا جدید اسلامی تناظر میں مطالعہ اور ان علوم میں مغربی نقطۂ نظر کا تنقیدی مطالعہ

ix۔ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ اور مسلم فکر وتہذیب سے اس کا مقارنہ

x۔ تزکیۂ نفس کو شامل نصاب کرنا

۹۔ زبانوں پر دسترس خصوصاً اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر۔ نیز کسی ایک غیر ملکی زبان جیسے جرمن، فرنچ اور روسی زبان کا سیکھنا۔

۱۰۔ ایم اے میں تقابلی مطالعہ مثلاً اگر معاشیات پڑھنی ہے تو مغربی اور اسلامی معاشیات دونوں پڑھائی جائیں گی مقارنہ اور تنقیدی مطالعے کے ساتھ۔

۱۱۔ تخلیقی تحقیق کی صلاحیت خصوصاً اسلامی تناظر میں مسلم معاشرے کے زندہ مسائل کے حوالے سے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر

۱۲۔ عصری علوم کے نام پر پڑھائے جانے والے مغربی علوم کو اسلامی تناظر میں از سر نو مرتب کیا جائے گا اور ان کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا

۱۳۔ تزکیہ و تربیت اور تعمیر سیرت و کردار کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں گی اور اس کے لیے باقاعدہ نصاب و نظام مرتب کیا جائے گا۔

اس شمارے سے البرہان ایک نیا سلسلہ مضمون شروع کررہا ہے جس میں ملک کی اہم دینی جامعات اور اسلامی تناظر میں کام کرنے والے جدید تعلیم کے اداروں کا تعارف شائع کیا جائے گا تاکہ عام لوگ بھی ان تعلیمی اداروں سے واقف ہوسکیں اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے دینی اور جدید تعلیم کے ادارے ان بڑے مراکز ہائے علمی کے طریق کار اور علمی مناہج سے واقف ہوسکیں۔ اس سلسلے کا آغاز ہم دارالعلوم کراچی کے تعارف سے کررہے ہیں جو دینی جامعات میں ایک بڑا نام ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ البرہان کی تنگ دامنی کے باعث یہ تعارف مختصر ہی رہے گا اور ہم تفصیلات میں نہ جاسکیں گے۔ امین

یہ کام کون کرے؟

ہماری حکومتیں کروڑوں روپے تعلیم پر ہر سال خرچ کرتی ہیں لیکن دینی تعلیم پر ایک پیسہ خرچ کرنے کی توفیق انہیں نہیں ہوتی حالانکہ دینی تعلیم کا انتظام کرنا ان کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو تعلیمی ادارے سرکاری کھاتے میں چلے جاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ غیر فعال اور غیر مؤثر ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر محض کاغذوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔

دوسری صورت پرائیویٹ پبلک پارٹنر شپ کی ہے کہ یہ کام اصلاً تو پرائیویٹ سیکٹر کرے لیکن پبلک سیکٹر (یعنی حکومت) اس کا ہاتھ بٹائے۔ بنگلہ دیش اور انڈونیشیا میں یہ تجربہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں مدارس عالیہ اور انڈونیشیا میں سنتری کے نام سے ایسے ہزاروں مدارس کامیابی سے چل رہے ہیں جو علماء کرام کے ہاتھ میں ہیں اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور حکومت ان کو مالی امداد بھی دیتی ہے اور ان کی ڈگریاں بھی تسلیم کرتی ہے۔

اور آخری صورت یہ ہے کہ اگر حکومت کسی قسم کا تعاون نہ بھی کرے تو پرائیویٹ سیکٹر خود اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ عوام اور مخیر حضرات کی اگر ذہن سازی کی جائے تو جس طرح وہ موجودہ دینی مدارس کی مالی مدد کرتے ہیں وہ نئے مدارس کی بھی اعانت کریں گے اور یہ بتدریج اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں گے۔ بلکہ خود علماء کرام کو وسعت قلب ونظر سے کام لینا چاہیے اور موجودہ دینی مدارس کو اس نئے رول ماڈل کے مطابق ڈھال لینا چاہیے یا اگر کوئی اور یہ کام کرے تو انہیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ **ھذامن عندنا**

۲۰۱۱ء

والعلم عنداللہ۔

پاکستان کی اہم دینی جامعات

دارالعلوم کراچی

ایک تعارف

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان تشریف لائے تو چندے انتظار کیا کہ حکومت نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے اقدامات کرے لیکن مایوس ہو کر اپنا مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتداء میں کراچی کے محلہ نانک واڑہ میں ایک پرائمری سکول کی متروکہ عمارت مفتی صاحب نے مدرسہ کے لیے الاٹ کرائی اور تدریس کا آغاز کر دیا۔ جلد ہی یہ جگہ کم پڑنے لگی تو پہلے آپ نے جامعہ کے لیے وہ جگہ حاصل کی جہاں آج کل اسلامیہ کالج کراچی واقع ہے لیکن بعض موانع کی وجہ سے وہاں کام کا آغاز نہ ہوسکا تو جنوبی افریقہ کے ایک مخیر تاجر نے وہ ۵۷ ایکڑ جگہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی جہاں آج کل دارالعلوم کورنگی قائم ہے۔ اس وقت یہ جگہ بے آباد ریگستان اور شہر سے باہر تھی، کورنگی بھی بعد میں آباد ہوا۔ دارالعلوم یہاں ۱۹۵۵ء میں منتقل ہوا تھا۔

اغراض واہداف

۱۔ عامۃ المسلمین میں علوم شرعیہ (قرآن وحدیث، عقائد وفقہ وغیرہ) اور اس کے متعلقہ علوم کی ترویج واشاعت۔

۲۔ قرآن وحدیث، فقہ اور عقائد کی ایسی حکیمانہ اور محققانہ طرز تعلیم کا انتظام جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کا خاطر خواہ لحاظ رکھا جائے اور جس سے اہل بصیرت اور ماہر علماء دین پیدا ہوسکیں۔

۳۔ علوم دینیہ کی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ خصوصی شعبوں میں ایسے متخصصین تیار کرنا جو دین کے اہم شعبوں میں کامل بصیرت اور مہارت حاصل کر کے کسی مخصوص میدان میں مثلاً قضاء و افتاء، دعوت و تبلیغ، تصنیف وتالیف وغیرہ میں امتیازی خدمات انجام دے سکیں۔

دارالعلوم کا مسلک فقہ حنفی اور مشرب دارالعلوم دیوبند کے منہج کا اتباع ہے۔

دارالعلوم کی خدمات اور سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے انہیں چار بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ انتظامیہ(Administration) ۲۔شعبۂ تعلیمات(Academics) ۳۔ عصری تعلیم (Contemporary Education) ۴۔ ذیلی خدماتی شعبے(Support Services)

انتظامیہ

دارالعلوم کی مجلس منتظمہ تیرہ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ دارالعلوم کا سب سے بااختیار دستوری ادارہ ہے جسے دارالعلوم کے سرمایہ، املاک اورنظم ونسق کے بارے میں تمام اختیارات حاصل ہیں۔ دارالعلوم کی انتظامیہ میں صدر، ناظم اور شیخ الحدیث کا اہم کردار ہوتا ہے۔ پہلے مولانا صدر مفتی محمد شفیع صاحبؒ، دوسرے ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحبؒ اور موجودہ صدر مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ ہیں جبکہ پہلے ناظم مولانا نور احمد صاحبؒ، دوسرے مولانا سبحان محمود صاحبؒ، تیسرے مولانا شمس الحق صاحبؒ اور موجودہ ناظم مولانا راحت علی ہاشمی صاحب ہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث تھے، ان کے بعد مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ، مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور مولانا سبحان محمود صاحبؒ نے یہ ذمہ داری نبھائی جبکہ موجودہ شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔

شعبۂ تعلیمات

دارالعلوم اس وقت نہ صرف ایک جامعہ(University) کا روپ دھار چکا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کا پہلی جماعت سے لے کر درجۂ تخصص(Post-graduate) تک ایک اپنا مکمل تعلیمی نظام ہے اور چونکہ اس میں مسجد بھی ہے، اساتذہ اور طلبہ کی رہائش گاہیں بھی ہیں، انتظامی دفاتر بھی ہیں، تحقیق، نشرو اشاعت اور لائبریری کا انتظام بھی ہے لہٰذا اسے یونیورسٹی ٹاؤن کہنا بجا ہوگا۔ دارالعلوم کے چار بڑے تدریسی شعبے ہیں: درس نظامی، تعلیم تخصص، تحفیظ القرآن اور مدرسۃ البنات۔

۱۔ درس نظامی

اگرچہ درس نظامی کو عموماً ۸ سالہ کورس کہا جاتا ہے (ثانویہ عامہ، خاصہ، عالیہ اور عالمیہ، ہر کورس دو سال کا) لیکن دارالعلوم میں حفظ کے ساتھ پرائمری کی تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے اور چھٹی سے دسویں تک اگلی پانچ سالہ تعلیم کا بھی جسے 'مرحلۂ متوسطہ' کہا جاتا ہے۔ طلبہ میٹرک کا امتحان کراچی ایجوکیشن بورڈ کے تحت دیتے ہیں اور درس نظامی کی تکمیل کے بعد تخصص کا انتظام بھی ہے۔

درس نظامی کا تعلیمی سال ۱۶ شوال کو شروع ہوتا ہے اور ۱۵ شعبان کو سالانہ امتحان کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ سال میں تین امتحانات ہوتے ہیں۔ پہلی سہ ماہی کا صفر میں، ششماہی امتحان جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ امتحان ماہ شعبان میں ہوتا ہے۔ ۱۵ شعبان سے ۱۰ شوال تک اس شعبے میں تعطیل رہتی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں درس نظامی میں اساتذہ کی تعداد ۸۷ تھی جبکہ طلبہ کی تعداد تقریباً ۱۰،۰۰۰ تھی۔ مستحق اور نادار طلبہ کو جامعہ کی طرف سے قیام، طعام اور معقول وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ موسم کے اعتبار سے کپڑے اور لحاف وغیرہ بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔

۲۔ شعبۂ تخصص فی الفقہ والافتاء

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ پر فقہی مزاج غالب تھا اور آپ کی خواہش تھی کہ افتاء کی تعلیم کے لیے ایک مستند شعبہ قائم کیا جائے جس میں ذی استعداد طلبہ کو تمرین افتاء کرائی جاسکے چنانچہ آج یہ شعبہ بہترین مفتیوں کے زیرنگرانی چل رہا ہے۔ اس میں داخلے کی اولیں شرط یہ ہے کہ کسی مستند ادارہ سے عالمیہ کا امتحان بتقدیر ''ممتاز'' پاس کیا ہو۔ اس شعبہ میں محدود اور لائق طلبہ کو ہی داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کا دورانیہ تین سال کا ہے۔ ابتدائی دو سالوں میں طالب علم میں استخراج مسائل کا اچھا ملکہ پیدا کیا جاتا ہے جبکہ آخری سال میں طالب علم کو تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا ہے۔

دارالعلوم میں پچھلے کچھ عرصے سے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کا اجراء بھی کر دیا گیا ہے تاکہ اس شعبے میں بھی رجال کار تیار کیے جاسکیں۔

۳۔ شعبۂ تحفیظ القرآن

یہ دارالعلوم کے قدیم شعبوں میں سے ہے، نانکواڑہ کی عمارت اب حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے لیے مختص ہے۔ دارالعلوم کورنگی میں اس کے لیے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں ۶۲۵ طلبہ زیر تعلیم ہیں اور اساتذہ کی تعداد ۲۴ ہے۔

۴۔ مدرسۃ البنات

کسی بھی معاشرہ میں عورت کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فرد کی تعمیر میں خصوصاً اس کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ اسی نظریے کے پیش نظر دارالعلوم میں مدرسۃ البنات کا شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کا باقاعدہ افتتاح ۱۹۹۱ء میں ہوا۔ اس میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم

کے لیے مدرسہ ابتدائیہ وثانویہ بھی موجود ہیں۔

۵۔ تصنیف وتحقیق

دارالعلوم کا شعبۂ تحقیق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ اس ادارے کے تحت موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل اور دوسرے دقیق علمی موضوعات پر تحقیق وتصنیف کا کام ہوتا ہے۔ اس شعبہ کے پاس علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اس شعبہ کے تحت جو اہم کتب منظر عام پر آچکی ہیں ان میں سے ایک **فتح الملهم** ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی صحیح مسلم کی شرح ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پانچ جلدیں مکمل کر سکے تھے ان کے بعد مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس کی تکمیل کی ہے۔ ۲۔ معارف القرآن انگریزی ۳۔ تین جلدوں میں درس ترمذی۔ یہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی جامع ترمذی کی شرح ہے۔ حصہ معاملات مولانا عبداللہ میمن صاحب نے مرتب فرمائی ہے۔ ۴۔ جواہر الفقہ: یہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے مختلف فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔ ۵۔ امدادالاحکام: یہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ کے قلم سے لکھے گئے فتاوی ہیں جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیر نگرانی مرتب کیے گئے تھے۔

ان کے علاوہ اس شعبے کے تحت ''**ضابطة المفطرات فی مجال التداوی، حاشية شرح عقود رسم المفتی، مكانةالاجماع فی التشريع الاسلامی، بائبل سے قرآن تک اور النحو الصغير للطبرانی** جیسی علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

دارالافتاء

مولانا مفتی محمد شفیعؒ ایک کہنہ مشق فقیہ تھے اور دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کے منصب پر فائز تھے۔ جب آپ کراچی تشریف لائے تو یہاں بھی لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے کثرت سے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے دارالعلوم قائم فرمایا تو ساتھ ہی دارالافتاء بھی قائم فرمایا۔ آپ کے زیر سرپرستی آپ کے تربیت یافتہ دیگر مفتی حضرات نے بھی یہ خدمت خوب انجام دی اور دے رہے ہیں جن میں مفتی محمد رفیع عثمانی، مفتی محمد تقی عثمانی، مفتی محمود اشرف عثمانی، مفتی عبدالرؤف سکھروی، مفتی اصغر علی ربّانی اور مفتی عبدالمنان صاحب کے نام نمایاں ہیں۔

دارالعلوم کے دارالافتاء سے اس وقت تک پانچ لاکھ سے زیادہ فتاوی جاری ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی

مسئلہ نہایت اہم اور تحقیق طلب ہو تو ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' کے لیے اس کو الگ رکھ دیا جاتا ہے اور سائل کو خط کے ذریعے بتا دیا جاتا ہے کہ آپ کا مسئلہ تحقیق طلب ہے اور اس میں وقت لگے گا۔ جو مسائل قدرے غور طلب ہوں وہ دارالافتاء ہی میں متعین مفتی حضرات کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ درمیانہ درجہ کے مسائل درجہ تخصص کے سال دوم اور سال سوم کے طلبہ کو لکھنے کے لیے دیے جاتے ہیں اور آسان مسائل درجہ تخصص کے سال اوّل کے طلبہ حل کرتے ہیں، اب سب صورتوں میں بڑے مفتی حضرات کی تصدیق موجود ہوتی ہے۔ان صورتوں میں استفتاء مختلف مراحل سے گزرتا ہے جس کے لیے وقت ناگزیر ہے۔ اس لیے فتوی عموماً ایک ہفتہ بعد مستفتی کو واپس کیا جاتا ہے۔

مسائل بھیجنے کا پتہ ''شعبہ دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کورنگی، کراچی نمبر 14'' اور ٹیلیفون نمبر مندرجہ ذیل ہیں: 021-35046885 / 35049774

اب تک دارالعلوم سے جتنے فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں ان کی تبویب کا کام بھی جاری ہے اور تمام فتاویٰ کمپیوٹر میں محفوظ کیے جا رہے ہیں تا کہ بعد میں ان کو شائع کیا جا سکے۔

موسوعۃ الحدیث

یہ شعبہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور بعض دوسرے علماء کی تجویز پر قائم کیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ جتنی بھی احادیث ہیں ان کو اس طرح ایک جگہ جمع کیا جائے کہ کوئی حدیث مکرر نہ ہو اور کوئی حدیث چھوٹنے نہ پائے اور ساتھ ساتھ اس کو ایک نمبر دیا جائے جو سارے عالم اسلام میں مستند شمار ہو جس طرح کہ قرآن کریم کی آیات کے نمبر مخصوص ہیں۔ یہ تجویز مفتی تقی عثمانی صاحب نے ۲۰۰۱ء میں مکہ مکرمہ میں علماء کرام کے ایک اجتماع میں پیش کی تو سب نے اس کا خیر مقدم کیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمہ اس کے طریقہ کار اور مختلف پہلوؤں پر غور کرنا تھا۔ابتداءً پچاس ایسے مصادر منتخب کیے گیے جن میں احادیث مسندہ مروی تھیں۔ بعد ازاں ان میں اضافہ کر دیا گیا اور اب ان مصادر کی تعداد ۴۷ ہے۔ اس کے بعد ان مصادر کو جمع کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ مصادر جمع ہوتے ہی 2002ء میں باقاعدہ کام کا آغاز کر دیا گیا۔ اس شعبہ میں ۷ ذی استعداد فاضلین و متخصصین کام کر رہے ہیں۔

نشر و اشاعت

مکتبہ دار العلوم

یہ شعبہ دار التصنیف کا اشاعتی ادارہ ہے اور خود کفیل شعبہ ہے۔ نشر و اشاعت اور کتابت و طباعت کا سارا انتظام اسی شعبے کے ذمے ہے۔ یہ شعبہ علمی، تبلیغی اور تحقیقی کتابوں کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہ کتابیں قیمتاً فروخت کی جاتی ہیں اور آمدنی اسی مکتبہ کے لیے جمع رکھی جاتی ہے۔

ماہنامہ البلاغ

دین کی اشاعت، عامۃ الناس کی رہنمائی اور انہیں فتنوں سے بچانے کے لیے دار العلوم نے ماہنامہ البلاغ کا آغاز ۱۹۶۶ء میں کیا۔ اس وقت اس کے نگران مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں اور یہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہو رہا ہے۔

لائبریری

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو کتابوں سے خاص شغف تھا۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے کتب خانہ قائم فرمایا اور اپنا ذاتی ذخیرۂ کتب اس کے لیے وقف کر دیا۔ آج اس کی ایک پر شکوہ عمارت ہے۔ یہ کتب خانہ ملک کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور مختلف اسلامی موضوعات پر یہاں ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ کتابوں کی حفاظت کے لیے نہایت عمدہ نظام موجود ہے۔ کتب خانہ وقف ابتداء سال میں طلبہ کو عاریۃً کتابیں مہیا کرتا ہے جس کو طلبہ آخر سال میں واپس کر دیتے ہیں۔

ہوسٹل (دار الطلبہ)

دار العلوم نے اپنے طلبہ کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے تاکہ وہ ہمہ وقت اپنی تعلیم پر توجہ دیں اور خارجی ضروریات کے لیے کسی محنت سے مستغنی رہیں ہوسٹل قائم کیا ہوا ہے جو تین ''داروں'' پر مشتمل ہے: دار الصدیق، دار الفاروق اور دار عثمان۔ ہر دار میں ۱۶۸ کمرے ہیں اور ہر کمرے میں پانچ طلبہ رہتے ہیں۔ ہوسٹل کی بلڈنگ چار منزلہ ہے اور ہر منزل میں قیم مقرر ہے۔ طلبہ کے لیے

☆ اس مضمون کے تمام اعداد و شمار 2008ء کے ہیں۔

کپڑے دھونے اور سکھانے کے دھوبی گھاٹ، استری روم، مطبخ (کچن) وغیرہ کی سہولیات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ہوسٹل کی توسیع بھی دارالعلوم کے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔

مطبخ

نادار اور غریب طلبہ کے لیے جامعہ کی طرف سے طعام کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک عمارت مختص ہے جس میں تقریباً دو ہزار طلبہ کے لیے دو وقت کھانا پکتا ہے۔ طلبہ کی کثرت اور سہولت کو دیکھتے ہوئے مطبخ کی وسیع عمارت زیر تعمیر ہے جس میں بیک وقت چار ہزار طلبہ کھانا کھا سکیں گے۔

توسیعی تعلیمی خدمات

مکاتب تعلیم القرآن

دارالعلوم کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ قرآنی تعلیم کو پورے شہر میں عام کر دیا جائے۔ کیونکہ کراچی ایک وسیع شہر ہے اور سارے شہر والوں کے لیے یہاں سے براہ راست استفادہ ممکن نہیں تھا اس لیے شہر کے مختلف حصوں میں مکاتب قرآنیہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس وقت دارالعلوم کے تحت ۳۰ مکاتب قرآنیہ کام کر رہے ہیں۔ دارالعلوم سے ان کے الحاق کے لیے مخصوص شرطیں ہیں۔ دو تہائی مصارف دارالعلوم کرتا ہے اور ایک تہائی محلہ کمیٹی کے ذمے ہوتے ہیں۔ دارالعلوم کی طرف سے ان مکاتب کا ایک نگران مقرر ہے جو ان مکاتب کی نگرانی کرتا اور امتحانات وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ اس وقت ان مکاتب قرآنیہ میں ۲۵۵۹ طلبہ زیر تعلیم ہیں☆۔

دارالعلوم کے تحت مساجد

اس وقت دارالعلوم کے تحت تین مساجد ہیں:

محمدی مسجد: یہ دارالعلوم کے قریب کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع ہے، اس میں مکتب قرآنی قائم ہے۔

جامع مسجد بیت المکرم گلشن اقبال: دارالعلوم کے تحت یہاں درجہ رابعہ تک درس نظامی کی تعلیم ہورہی ہے۔ حفظ و ناظرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ مرکز الاقتصاد الاسلامی کا دفتر بھی یہاں قائم ہے۔

مسجد ناٹک واڑہ: یہاں حفظ و ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

عصری تعلیم

مدرسہ ابتدائیہ وثانویہ

دارالعلوم کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے رجال کار تیار کیے جائیں جو معاشرہ کی تمام ضروریات سے آگاہ ہوں اور عصری تعلیم بھی رکھتے ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مدرسہ ابتدائیہ وثانویہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں اس وقت ۵۰۳ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ میٹرک تک یہ مدرسہ کراچی ایجوکیشن بورڈ سے منظور شدہ ہے اور ہر سال یہاں کے طلبہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ مختلف کلاسوں کی فیسیں کم وبیش ہیں۔ طلبہ کا یونیفارم شلوار قمیض اور ٹوپی ہے۔ اس سکول کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ:

۱۔ اگر بچہ میٹرک کے بعد درس نظامی میں جائے تو اسے بنیادی دینی معلومات پہلے سے حاصل ہوں۔

۲۔ اگر کسی دنیاوی ادارے میں چلا جائے تو اچھی دینی معلومات رکھنے کی وجہ سے غیر صالح ماحول سے متاثر نہ ہو۔

۳۔ سرکاری اداروں اور دفاتر میں ایسے لوگ پہنچیں جو دین کی بنیادوں پر مسلمانوں کی خدمت کرسکیں۔

حرا فاؤنڈیشن

یہ دارالعلوم کا جدید شعبہ ہے جس کا مقصد کیمبرج نظام تعلیم کے طرز پر مسلمان بچوں کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنا ہے تا کہ وہ نہ صرف جدید علوم سے آراستہ ہوں بلکہ ان کے نظریات بھی اسلامی ہوں۔ اس فاؤنڈیشن کے پیش نظر یہ ہے کہ:

۱۔ ایک ایسے جدید اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے جو شرعی اصولوں کے تحت چلنے والا اور اعلیٰ سطح کے ہم عصر اسکولوں کا مقابلہ کرنے والا ہو۔

۲۔ جو بچوں کو اسلامی علوم واقدار اور معیاری تعلیم سیکھنے کے لیے ایک اچھا ماحول فراہم کرے اور اس کے ساتھ جدید درسی اسلوب کو بروئے کار لاتے ہوئے کیمبرج اسکولوں کے تحت چلنے والے سکولوں کے طرز پر ہو۔

۳۔ ایسے بچوں کی تیاری جو مسلمانوں کا اتباع کرنے والے اور سچے پاکستانی ہوں، جو خود اعتمادی کے ساتھ عالمی چیلنجوں کا سامنا کرسکتے ہوں اور اپنے اپنے پیشوں/شعبوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں۔

۴۔ یہ ایسا سکول ہے جو بچوں کو عالم بننے کے قابل بنائے یا اس قابل بنائے کہ وہ اعلیٰ شہرت کے حامل پیشہ وارانہ تعلیمی اداروں میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

مرکز الاقتصاد الاسلامی

مرکز الاقتصاد الاسلامی دارالعلوم کراچی کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کے چیئر مین مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، چیف ایگزیکٹومولانا عمران اشرف عثمانی صاحب اور شریعہ کنسلٹنٹ مفتی محمد یحییٰ عاصم صاحب ہیں۔اس ادارے کے اغراض ومقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ معاشی اقتصادی اور بینکاری کے شعبوں میں شریعت کی تنفیذ کے لیے ایک وسیع البنیاد مرکز فراہم کرنا۔

۲۔ سود سے پاک اقتصادی نظام کے فوائد کو اجاگر کر کے اسلامی طرز بینکاری، فنانس اور تمویل کی طلب پیدا کرنا۔

۳۔ اس طلب کو پورا کرنے کے لیے بنیادی اور اطلاقی تحقیق کرنا تا کہ اقتصادیات، مالیات اور بینکاری میں شریعت کے اطلاق کے لیے عملی خدوخال طے کیے جاسکیں۔

۴۔ علماء کرام کو مالیات اور بینکاری کے مروجہ نظام اور طریقوں سے عملی طور پر روشناس کرانا تا کہ بینکاری و مالیات کے شعبوں سے واقف پیشہ ورافراد کی ضرورت پوری کی جاسکے۔

۵۔ بذریعہ تربیت شریعت سے واقف بینکاروں کی ٹیم تیار کرنا تا کہ وہ موجودہ سودی بینکاری نظام کوشرعی بینکاری نظام میں ڈھالنے میں معاون ثابت ہو۔

۶۔ مروجہ بینکاری نظام میں غیر اسلامی طریقوں کا کھوج لگانا اور علماء کرام کے ماہر مالیات سے روابط پیدا کر کے متبادل طریقوں کی تلاش کے لیے تحقیق کرنا۔

۷۔ ایک اطلاعاتی مرکز کا قیام جو معلومات جمع کرنے اور انہیں دنیا کے عالمی واقتصادی اداروں تک پہنچانے کا کام کرے گا۔

۸۔ اس سلسلے میں سیمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپوں کا اہتمام کرتے رہنا۔مختلف ابلاغی ذرائع استعمال کر کے عوام اور کاروباری حضرات کو اسلامی اقتصادی تعلیمات سے آگاہ کرنا۔

سپورٹ سروسز (ذیلی خدماتی ادارے)

اس شعبے کے تحت درج ذیل پانچ ادارے کام کررہے ہیں:

i۔ شعبۂ تعمیر و ترقی

دارالعلوم تقریباً ۷۹ ایکڑ پر محیط ہے جو چاردیواری میں محصور ہے۔ تقریباً ۲۵ ایکڑ تعمیری رقبہ ہے۔ اس رقبہ پر اب تک درسگاہیں، دارالطلبہ کے تین بلاک، دفاتر کا ایک بلاک، جدید دارالحدیث، جدید دارالافتاء، اساتذہ کرام کے گھر، مدرسہ ابتدائیہ، سڑکیں، مرکزی دروازہ وغیرہ تعمیر ہوچکی ہیں۔ زیر تکمیل منصوبوں میں مسجد، مطبخ، حرا فاؤنڈیشن، جنریٹر روم، گیس ہیٹر روم اور سڑکیں وغیرہ شامل ہیں۔ آئندہ منصوبوں میں اساتذہ کرام کے گھروں اور سوئمنگ پول کی تعمیر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ شعبہ دارالعلوم کی تمام قدیم و جدید تعمیرات کی اصلاح و ترمیم، جدید منصوبوں کی پلاننگ اور تعمیر و تکمیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ تعمیرات کے علاوہ بجلی اور گیس کی سپلائی بھی اسی شعبہ کا فریضہ ہے۔ اس شعبے کے تحت ۳۶ افراد مستقل بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔

ii۔ شعبۂ حسابات

دارالعلوم حکومت کے پاس باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ ہے اور ریونیو بورڈ نے دارالعلوم کی امداد وعطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے۔ اس شعبے کے ذریعے دارالعلوم کی یومیہ آمدورفت کا حساب رکھا جاتا ہے اور ہر مد کو متعلقہ مصرف میں خرچ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آمدورفت میں تمام حسابات رجسٹرڈ آڈیٹر کے ذریعے آڈٹ ہوتے ہیں اور ہر سال آڈٹ رپورٹ تیار ہوتی ہے۔ اس وقت شعبہ محاسبی میں ۱۱ افراد کا عملہ مصروف عمل ہے اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی خدمات بھی حاصل ہیں۔

iii۔ استقبالیہ

یہ شعبہ ڈاک و تار کی ترسیل، ٹیلیفون کی پیغام رسانی، مہمانوں کی ضیافت اور متعلقہ شعبوں میں آنے والوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ دارالعلوم میں آنے والے عطیات و صدقات بھی وصول کرتا ہے اور شعبہ محاسبی میں منتقل کرتا ہے۔

iv۔ مرکز صحت

دارالعلوم میں طلبہ کے لیے ایک سند یافتہ اور ماہر طبیب کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عملہ

کے ۳ افراد ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔طلبہ کو مفت دواؤں کی سہولت بھی میسر ہے اور اگر کوئی طالب علم زیادہ بیمار ہوتو اسے مدرسہ کی طرف سے اچھے ہسپتال میں علاج کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

۷۔ سیکورٹی (شعبہ محافظین)

دارالعلوم بڑے رقبے پر محیط ادارہ ہے اس کی حفاظت اور دوسرے متعلقہ کاموں کے لیے 'محافظین' کا شعبہ قائم ہے جو ادارے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے زیر انتظام وقف شدہ زمینوں اور جائیدادوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

پاکستانیات　　**ملک احمد سرور**

پاکستان توڑنے کی امریکی سازشیں

کراچی میں لگی آگ کی تپش سے پشاور تک جھلس رہا ہے اور بلوچستان میں کٹتی گردنوں اور گرتی لاشوں کا درد لاہور تک کو تڑپا رہا ہے مگر اسلام آباد خوش وخرم اور مطمئن ہے۔موسم برسات نے سرزمین پاکستان کو تو سرسبز وشاداب کردیا ہے مگر بلوچستان وکراچی میں لگی آگ امیدوں کے خرمن میں بچے آخری خوشے کو بھی بھسم کیے جارہی ہے۔عیار وکرپٹ حکمرانوں اور مگرمچھ صفت اپوزیشن کے سامنے عدلیہ کی بے بسی مایوسیوں کی نئی گھٹا بن کر آرہی ہے۔افغانستان سے امریکی رخصتی کے بعد طالبان کی بندوقوں کا رُخ تو شاید بدل جائے،آئی ایس آئی کی نئی پالیسی سے بیرونی تخریب کار ایجنسیوں کے پر بھی کٹ جائیں گے مگر سیاسی دہشت گردی، لوٹ مار اور کرپشن کے عفریت عوام کے بچے کھچے چیتھڑے بھی اڑا کر رکھ دیں گے۔ بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان''ملک انتہائی خطروں میں گھرا ہوا ہے اور حکمرانوں کی آنکھیں بند ہیں۔''

گزشتہ صدی کے آخری سالوں میں ہی مغرب کے سیاسی پنڈتوں اور تھنک ٹینکوں نے یہ پیش گوئیاں شروع کردی تھیں کہ پاکستان ۲۰۱۰ء تک ٹوٹ جائے گا۔ ۲۰۰۵ء میں ڈیڈ لائن کو ۲۰۱۵ء تک پہنچادیا گیا مگر بعض کے خیال میں پاکستان ۲۰۲۵ء تک بھی بچارہ سکتا ہے۔ یہ پیش گوئیاں نہیں دراصل امریکہ اور پاکستان دشمن دیگر ممالک کے منصوبے ہیں جنہیں تھنک ٹینکس اپنی تحقیق کے نام پر پیش کرتے رہتے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق امریکہ و برطانیہ کے ہاتھوں بے نظیر بھٹو کا قتل بھی

انہی منصوبوں کا حصہ ہے۔

۲۰۰۵ء میں یو ایس نیشنل انٹیلی جنس کونسل (NIC) اور سی آئی اے کے حوالے سے جو رپورٹ منظر عام پر آئی تھی، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ پاکستان کی قسمت یوگوسلاویہ کی طرح ہے۔ اگلی دہائی میں پاکستان خانہ جنگی، خون ریزی اور بین الصوبائی لڑائیوں کا شکار ہوگا (Energy Compass March, 2005)۔ NIC اور CIA کے مطابق پاکستان کی قسمت میں 'ناکام ریاست' ہونا لکھا جاچکا ہے۔ پاکستان عشروں کی معاشی اور سیاسی بدانتظامی، لاقانونیت، کرپشن اور لسانی تعصّبات کی دلدل سے آسانی سے نہیں نکل سکے گا۔

بین الاقوامی امور کے ماہرین کے مطابق پاکستان کے لیے امریکی ایجنڈا وہی ہے جو اس نے مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے لیے بنا رکھا ہے۔ امریکہ اپنے ان منصوبوں پر خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے لسانی تعصّبات اور مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دے کر عمل پیرا ہے۔ وہ مالی امداد اور سازشوں کے ذریعے حکومتی اداروں کو کمزور کر رہا ہے اور مقصد پاکستان کے قومی ڈھانچے کو توڑنا ہے۔ برطانوی خفیہ ایجنسی MI6، اسرائیلی موساد اور بھارتی را امریکی سی آئی اے کی مدد کر رہی ہیں۔ پاکستانی فوج پاکستان کو قائم ودائم رکھنے کے لیے ایک مثالی ادارہ ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے ''دہشت گردی کے خلاف آپریشنوں'' کے نام پر اسے عوام سے لڑا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے پرویز مشرف کو خصوصی طور پر لایا گیا۔ امپیکٹ انٹرنیشنل جو لندن سے شائع ہوا کرتا تھا، اس نے مارچ ۲۰۰۱ء میں پاکستان کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا، اس میں جنرل پرویز مشرف کے بارے میں امریکی منصوبے کا بھی ذکر تھا۔ مسٹر ملٹن بیرڈن ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں اسلام آباد میں سی آئی اے کا سٹیشن چیف تھا۔ اس نے امریکی سینٹ کی فارن ریلشنز کمیٹی کو بتایا کہ ''جنرل پرویز مشرف پاکستان آرمی آفیسرز کی اس آخری جنریشن کے فرد ہیں جو امریکہ اور پاکستان کی ملٹری پارٹنرشپ کے تربیت یافتہ ہیں، البتہ انہیں اوپر لانے کے لیے آئین معطل کرنا ہوگا۔۔۔ میرے اندازوں میں مشرف کی شخصیت ہماری آخری امید ہے جو دنیا میں ہمارے لیے آخری مضبوط قوت کے طور پر کام کرنے والی ہوگی۔۔۔ نہ صرف جنوبی ایشیا میں پاکستان کو ایک اہم راہ پر ڈال سکتی ہے بلکہ دوسری طرف وسطی ایشیا میں بھی۔'' اور جنرل پرویز مشرف نے امریکی امیدوں سے بھی بڑھ کر کام دکھایا اور

اس کے بعد آنے والے تو امریکہ کے پچھائے ہوئے ٹریک پر سرپٹ دوڑنے لگے اور بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان: ''ہمارے حکمران امریکہ کی اس پیش گوئی (کہ پاکستان ۲۰۱۵ء میں ٹوٹ جائے گا) کو پورا کرنے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔''

ایک دہائی قبل پاکستانی عوام کو فوج سے جو محبت وعقیدت تھی، اس میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور یہ دراڑیں انتہائی خطرناک ہیں۔آئی ایس آئی کا دفاتر، گلیوں وغیرہ میں جس قابل فخر انداز سے ذکر ہوتا تھا، وہ اب سننے کو نہیں ملتا۔ پاکستان فوج اور آئی ایس آئی کا قصیدہ خواں اسلام پسند طبقہ تھا، جنرل پرویز مشرف کے ذریعے امریکہ نے اسی طبقے کے خلاف آپریشن کرواکے اس محبت وعقیدت اور قصیدہ خوانی پر کاری ضرب لگادی۔ یہ دراڑیں فوج ہی پاٹ سکتی ہے۔ پاک فوج نے امریکہ کو جو آنکھیں دکھانا شروع کی ہیں، اس سے دراڑوں کی خلیج کم ہونا شروع ہوگئی ہے۔

امریکہ ۲۰۱۵ء تک پاکستان کو توڑنے کا مقصد حاصل کرنے کے لیے بھارت، برطانیہ، اسرائیل کے علاوہ پاکستان کے مؤثر طبقات کو بھی استعمال کررہا ہے جن میں علماء کے فرقہ وارانہ اور سیاست دانوں کے لسانی گروہ بھی شامل ہیں اور ان پر امریکہ کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔اس کی نمایاں مثال گورنر عشرت العباد کی واپسی اور علماء کی ایک فرقہ پرست جماعت ہے۔افغانستان میں امریکہ بھارت کے ذریعے علیحدگی پسند بلوچوں اور پاکستان مخالف پختونوں کو تربیت دے رہا ہے۔اس نیٹ ورک کو وسیع کرنے کے لیے امریکی ہدایت پر ہمارے میڈیا اینکرز اور کالم نگار حقانی نیٹ ورک کے خلاف آپریشن کے لیے دباؤ بڑھا رہے ہیں۔ یہی وہ طالبان کا بڑا گروپ ہے جو پاکستان سے دل وجان سے محبت رکھتا ہے، آپریشن کے نتیجے میں اگر یہ پاکستان مخالف ہوجاتا ہے تو خیبر پختونخوا میں امریکی عزائم پورے ہوجاتے ہیں۔

بلوچستان میں بلوچ لبریشن آرمی (BLA) کو کسووا لبریشن آرمی (KLA) کی طرز پر تشکیل دیا گیا ہے اور پرویز مشرف دور میں یہ معرض وجود میں آئی۔ نہ جانے اور کون کون سے گروپ امریکی ہدایت پر ملک میں انتشار وانارکی پھیلانے میں مصروف ہیں۔کراچی کی ٹارگٹ کلنگ محض لسانی مسئلہ نہیں ہے، یہ پاکستان کو ۲۰۱۵ء تک توڑنے کی سازش ہے۔ جہادی گروپ صحیح ہیں یا غلط لیکن ان کی حب الوطنی پر شک نہیں کیا جاسکتا، ان کی تو وجہ تشکیل ہی اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف لڑنا

ہے۔ امریکہ نے سازش کے تحت پرویز مشرف کے ذریعے انہیں پاک فوج کے خلاف کردیا تاکہ پاکستان کی دفاعی قوت کمزور ہوجائے۔

پاکستان کے استحکام اور بقاء کا انحصار ''جہاد'' پر ہے۔ اس جذبے کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ گیارہ سال سے جہاد کے خلاف مہم جاری ہے۔ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے اور ''جہادی'' کہہ کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ پنجاب کا وزیر قانون رانا ثناء اللہ ''جہادی کلچر'' کے بارے میں فرماتا ہے: ''جہادی کلچر پیدا کرنے والے آمروں پر کروڑوں بار لعنت''۔ اگر جہاد کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث کو سامنے رکھیں تو جہادی کلچر پیدا کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے مدینے میں جہادی کلچر پیدا کیا۔ کوئی مسلمان جہادی کلچر پیدا کرنے والے پر لعنت نہیں بھیج سکتا، ایسا کام صرف ابوجہل اور ابولہب کے پیروکار ہی کرسکتے ہیں۔ جہادی کلچر پر لعنت بھیجنے کا مطلب پاکستانیوں کے جذبۂ جہاد اور دفاع پر لعنت بھیجنا ہے۔ پاکستان کو دفاعی طور پر کمزور کرنے کے لیے یہ بھی امریکی ہتھکنڈا ہے۔

پاکستان کو بدترین انارکی میں دھکیلنے کے لیے موجودہ حکمران ٹولہ بہترین کارگزاری کا مظاہرہ کررہاہے۔ عدالتی احکامات پر عمل پیرا نہ ہوکر حکمران طبقہ عوام کو انتشار اور فساد کی راہ دکھا رہاہے۔ یہ فساد جو ابھی کراچی وبلوچستان میں ہے، دیگر علاقوں میں بھی پھیل گیا تو پھر فوج سے بھی نہیں روکا جاسکے گا اور ناقابل تصور خون ریزی ہوگی۔ امریکہ اسی موقع کی تاک میں ہے تاکہ اقوام متحدہ سے مینڈیٹ لے کر وہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو اپنی تحویل میں لے سکے۔ اس کے بعد امن کے قیام پر وہ پاکستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بھارت کی سرپرستی میں دے دے گا۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے ایک بڑے قدم اور آپریشن کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا آپریشن کون کرے؟ پاکستان کا آئین ناقص ہے اور وہ موجودہ صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ دراصل مہذب اور قانون کے پابند ممالک میں ایسی صورت حال کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔

بعض کے خیال میں ''قومی حکومت'' مسئلے کا حل ہے۔ لیکن اس وقت عملاً قومی حکومت ہی ہے اور پارلیمنٹ کی سبھی جماعتیں کسی نہ کسی طرح حکومت میں شامل ہیں۔ کچھ مڈٹرم الیکشن کو مسئلے کا حل قرار دیتے ہیں مگر موجودہ الیکشن کمیشن اور انتظامیہ کے تحت عوام کے صحیح نمائندے منتخب نہیں ہوسکتے

اور صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہوسکتی ہے۔ اس کا بہترین حل عوام کے پاس ہے، اگر وہ انقلاب کا فیصلہ کریں۔ بدقسمتی سے عوام شخصیت پرستی میں بت پرستی سے بھی زیادہ غرق ہوچکے ہیں، اس لیے اچھے انقلاب کے امکانات کم ہیں۔ دوسرا حل چیف جسٹس کے پاس ہے کہ نظریۂ ضرورت کے تحت وہ ۶ تا۹ ماہ کے لیے فوج کی مدد سے ایک آزاد اور نگران حکومت بنادیں جو آزاد الیکشن کمیشن کی تشکیل اور انتظامیہ کی مکمل تطہیر کے بعد شفاف الیکشن کرادے۔ الیکشن کے قواعد وضوابط میں ہر قسم کے تعصب کو نااہلی کی شرط رکھا جائے لیکن خدشہ ہے کہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا قومی سیاسی اتحاد اس سے بھی اتفاق نہیں کرے گا اور نہ ہونے دے گا۔ اس لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ ''اے اللہ! تو قادر مطلق ہے۔ تو ہی اس ملک کو امریکہ کے مذموم عزائم سے محفوظ رکھ اور سیاسی قوتوں کو ہدایت اور عوام کو شعور دے۔ آمین'' (بشکریہ آفاق)۔

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری

مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج (۲)

ٹیکنالوجی کی بحث

ٹیکنالوجیکل ترقی کا یہ ماڈل جو کمیونسٹوں نے استعمال کیا اسے ترقی بذریعہ پلاننگ (Scientific Development by Virtue of Planning) کہا جاتا ہے۔ روسیوں نے اس کے لیے کام کرنا شروع کیا اور ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک پچاس برسوں میں انہوں نے جو ترقی کی اسی منہج کے مطابق کی جس میں ان کی شرح ترقی ۹ فیصد سے لے کر ۱۳ فیصد تھی اور گریز رڈ نے جب نیویارک میں جاکر تقریر کی تو اس نے کہا کہ ہم جس رفتار سے ترقی کررہے ہیں ہم امریکہ کو اس کے اندر دفن کردیں گے۔ خلاء (Space) کو انہوں نے پہلے مسخر کیا یعنی وہاں وہ پہلے پہنچے، حیاتیاتی سائنسز (Biological Sciences) انہوں نے پہلے ڈویلپ کیں، theoratical sceinces انہوں نے پہلے ڈویلپ کیں اور اس میں بے تحاشہ کام کیا اور انہوں نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کو اصل میں جس نے شکست دی وہ

روس کی سرخ فوج تھی۔ یہ روسی تھے جنہوں نے مشرقی یورپ کے محاذ پر جرمنوں کو شکست دی، امریکیوں کو تو مار ہی نہیں پڑی جب کہ روسیوں کے جنگ میں بیس لاکھ لوگ مارے گئے۔ لیکن ۱۹۷۴ء میں گریز رٹ نے یہ دعویٰ کیا اور ۱۹۸۹ء میں روس ٹوٹ گیا، گویا ایک دم غبارے سے ہوا نکل گئی۔

شرح ترقی اپنی جگہ لیکن ۱۹۸۲ء میں مشرقی یورپ ان کے ہاتھ سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۸۶ء میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ میں کوئی الزام نہیں لگا رہا، آپ گوگل پر جا کر سرچ کر لیجیے 'Solidarity Movements' اگر آپ گوگل پر ڈالیں تو وہ آپ کو بتائے گا کہ مشرقی یورپ جو روس کے ہاتھ سے نکلا وہ Technological Transformation کی وجہ سے نکلا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اس کی ابھی وضاحت کرتا ہوں۔ ابھی میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے انہوں نے یہ اصول اپنایا اور یہ طے کیا کہ وہ سائنسی ترقی کے لیے اپنے سائنس دانوں کو دنیا کی بہترین آسائشیں مہیا کریں گے۔ اس کے لیے اسٹالن نے ایسے شہر آباد کیے تھے اور ایسی جگہیں بنائی تھیں جہاں وہ اپنے سائنس دانوں کو رکھتے تھے اور دنیا کی بہترین سہولتیں انہیں مہیا کرتے تھے تاکہ یہ سائنس اور ترقی کے میدان میں کام کرتے رہیں اور روس لوگوں کی ضروریات پوری کرتا رہے۔ اس کے باوجود امریکہ ترقی کی دوڑ میں ان سے آگے نکل گیا۔ اتنا آگے نکل گیا کہ جب روس ڈوب رہا تھا تو امریکیوں نے آ کے اسے بچایا۔ روسیوں کے پاس ٹیکنالوجی تھی، ان کے پاس کمٹ منٹ تھی، وہ پڑھے لکھے لوگ تھے بلکہ شرح تعلیم وہاں سو فیصد تھی اور ان کی کمٹ منٹ تھی کہ وہ لوگوں کی ضروریات پوری کریں گے، ترقی کریں گے اور ان کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی، ان کے پاس دنیا کا بہترین اسلحہ تھا لیکن اس کے باوجود روس ٹوٹ گیا۔

اب آئیں دوسرے ماڈل کی طرف! اس کا مرکزی نقطہ ہے مارکیٹ یعنی سائنٹفک ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ کو آپ انسان کی حرص اور حسد کے ساتھ جوڑ دیں۔ یعنی مارکیٹ کے اندر کون سا سائنٹفک لاء استعمال کرنا ہے اور کیوں استعمال کرنا ہے، اس کی واحد قوت محرکہ یہ ہے کہ آپ کس طرح پیسہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اگر وہ ریاست کے مفاد کے خلاف نہیں ہے تو آپ جس سائنٹفک لاء کو استعمال کرنا چاہیں کریں اور جتنا زیادہ منافع کمانا چاہتے ہیں کمائیں اور جتنی ٹیکنالوجیکل ٹرانسفرمیشن

کرنا چاہتے ہیں کریں آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اس اصول کے نتیجے میں امریکہ اور یورپ کے اندر ہر طرح کی ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ ہوئی۔ لوگوں نے پیسہ بھی کمایا اور ترقی بھی کی بلکہ اس نے ٹیکنالوجی کو گھر گھر پہنچا دیا مثلاً امریکہ میں لوگوں کے پاس گاڑی جلد پہنچ گئی بہ نسبت روس کے حالانکہ روس میں گاڑی پہنچانے کی ذمہ داری ریاست کی تھی اور اس کی آبادی بھی کم تھی لہٰذا وہاں گاڑی پہلے پہنچی چاہیے تھی۔ اس کے برعکس امریکہ میں شہری کو خود جا کر گاڑی لانا ہوتی تھی لہٰذا وہاں تاخیر سے گاڑی لوگوں تک پہنچنا چاہیے تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بلکہ جو ہوا وہ یہ کہ امریکہ میں مارکیٹ نے اتنی زیادہ گاڑیاں بنائیں سستی اور اتنی انواع واقسام کی بنائیں کہ ہر آدمی کے پاس گاڑی پہنچ گئی۔

مشرقی یورپ کا حال یہ تھا کہ جب وہ مغربی یورپ کے آدمی کو دیکھتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ ہمارے پاس ایسی مریل ٹائپ کی گاڑی اور تمہارے پاس بہترین گاڑی کیوں ہے؟ یہ اس وجہ سے تھا کہ روس میں جو گاڑی بنتی تھی وہ ضرورت پوری کرنے کے لیے بنائی جاتی تھی اور امریکہ اور مغربی یورپ کے اندر ان کی عیاشی کو satisfy کرنے کے لیے بنائی جاتی تھی۔ تو تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ عیاشی کے لیے پیدا کی جانے والی ٹیکنالوجیکل گروتھ زیادہ تیز ہوتی ہے اور آسانی سے مہیا ہوجانے والی ہوتی ہے۔ مَیں کوئی الزام نہیں دے رہا بالکل بلکہ یہ ایک سائنسی اور عملی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور دنیا یہ مانتی ہے کہ امریکی ٹیکنالوجی روس کے مقابلے میں اتنی طاقتور تو نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ آسائش بخش اور بہتر تھی، آسانی سے میسر تھی اور اس کی ہینڈلنگ آسان تر تھی۔

لہٰذا آپ کو کوئی ماڈل ٹیکنالوجیکل ترقی کے لیے احیائے اسلام کے لیے استعمال کرنا ہے تو وہ یا تو Ideological ہوگا یا A-Ideological ہوگا۔ اگر آپ مذہبی آدمی ہیں تو A-Ideological تو نہیں ہوسکتا بلکہ لازماً آپ کا میکانیزم Ideological ہونا چاہیے اور اگر آپ نے ٹیکنالوجی ترقی کے اوپر کوئی نظریہ impose کرنے کی کوشش کی جیسے کہ روس نے کی تھی تو شرح ترقی گر جائے گی اور وہ اس ٹیکنالوجیکل ترقی کا مقابلہ نہ کرسکے گی جو بغیر کسی نظریے کے ہوگی۔

چین کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ماؤزے تنگ جب آیا، تو اس نے کہا کہ ہم نے تو ترقی کرنی ہے لیکن ان کی Ideological committment تھی سوشلزم کے ساتھ، لہٰذا انہوں نے کہا کہ سب metallergy پر کام کریں گے۔ غلط پلاننگ آپ نے کی Metallergy میں پیسہ ڈال دیا

نتیجتاً قحط پڑ گیا اور لاکھوں لوگ مر گئے۔ ایک آدمی نے سوچ کر پلان بنایا، پولیٹ بیورو یا کمیونسٹ کونسل نے منظور کر کے اس کو نافذ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ مر گئے۔ اب اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ماؤزے تنگ کو تو خدا کی طرح پوجا جاتا تھا اس سے کون پوچھتا؟ پھر جلدی وہ آنجہانی بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ڈنگ ژوچنگ آیا۔ اس نے عوام سے کہا کہ آپ جو بنانا چاہتے ہیں بنائیں اور اس نے معیشت کا رُخ موڑ دیا سوشلزم سے کیپٹل ازم کی طرف۔ دنیا میں اکثر کیپٹل ازم کے بعد سوشلزم آتا ہے لیکن یہاں سوشلزم کے بعد کیپٹل ازم آیا۔ جب چین نے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا لیا تو آپ دیکھ لیں کہ اس نے کس تیزی سے ترقی کی ہے۔ لیکن یہ ترقی سو فیصد سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے اس میں ریاست کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ریاست پلان نہیں کرتی کہ آپ کیا پروڈیوس کریں۔ آپ جو بھی پروڈیوس کریں ریاست کہتی ہے کہ اس میں کمیونٹی کی کانٹری بیوشن ہونی چاہیے۔ اگر کمیونٹی کی کانٹری بیوشن ہے تو آپ جتنا چاہیں اس پہ منافع لیں، چینیوں سے بھی لیں، باہر کے ملکوں سے بھی لیں لیکن انہوں نے اپنا سوشلزم اس میں نہیں ڈالا۔

اگر مذہب میں یقین رکھنے والا کوئی معاشرہ خصوصاً مسلمان جب ٹیکنالوجی میں ترقی کی بات کرے گا تو لازماً اسے اپنی اقدار کو قربان کرنا پڑے گا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ٹیکنالوجی میں ترقی کرے مارکیٹ کے ماڈل کے مطابق اور اس کی مذہبی اقدار ویسی کی ویسی رہیں۔ کیونکہ مارکیٹ میں ایک ویلیو چلتی ہے (Prime) MCM کے بقول Money, Commodity, Money Extended کہ آپ کی اکانومی ایسی اکانومی ہوتی ہے جس میں آپ پروڈکشن کے عمل میں شرکت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ آپ کو پیسہ بہت آنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کپٹلسٹ اکانومی میں پروڈکشن کے عمل میں شرکت نہیں کی جاتی۔ اگر آپ ہماری اس بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو معاف کیجیے گا کیپٹل ازم کی تفہیم کے بارے میں آپ کا وژن مشکوک ہے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے دونوں پیراڈائمز کی اپنی ویلیوز تھیں۔ کمیونسٹوں کی ویلیوز تھیں: انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنا، بورژوا اور ورکنگ کلاس کی ضروریات پوری کرنا اور سوشلسٹ انقلاب کو دنیا بھر میں برآمد کرنا۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ کے اندر ٹیکنالوجیکل ترقی

کے پیش نظر تھی آزادی (Freedom)۔اور سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی کا مطلب ہوتا ہے سرمائے کی آزادی کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں سرمایے کے بغیر آزادی کا تصور بے معنی ہے۔آپ کی جیب میں سکے نہ ہوں تو آپ کی آزادی چہ معنی دارد؟ آپ اکیلے بیٹھ کر خبطیوں کی طرح آزادی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں لیکن آزادی کے حق کو استعمال کرنے کے لیے آپ کے پاس سرمایہ ہونا چاہیے اور سرمایہ آتا ہے مارکیٹ کے جبر کو قبول کرنے کے نتیجے میں، مارکیٹ کی اقدار کو قبول کرنے کے نتیجے میں اور مارکیٹ کی صرف ایک قدر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ سرمایے کی شرح نمو تیز تر ہو مثلاً یہ جو آپ کے پاس موبائل ہے کمپنیوں نے وہ اس لیے نہیں بنایا کہ آپ اس ذریعے اپنے بچوں یا ماں باپ کے ساتھ بات کریں۔اس سے میں یہ کام لے سکتا ہوں لیکن میں اگر اس سے صرف یہی کام لیتا رہا تو ایک دن یہ موبائل میرے پاس نہیں رہے گا۔کیوں؟ کیونکہ موبائل پیسوں سے چلتا ہے فری میں نہیں چلتا۔ یہ اگر مجھے اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کا سب سے effective استعمال یہ ہے کہ یہ موبائل کتنا زیادہ مجھے جوڑتا ہے سرمایہ دارانہ عمل سے۔اگر اس موبائل سے میں بزنس روابط کو بڑھاتا ہوں تو میں ایسے دس موبائل خرید کر اپنے رشتے داروں میں بانٹ سکتا ہوں لیکن اگر اس سے مَیں صرف اپنے والد کی خیریت ہی معلوم کرتا رہا تو یہ موبائل میرے پاس سے چلا جائے گا کیونکہ اس سے میں اگر دھندہ نہیں کرتا تو اس میں روز کارڈ کہاں سے ڈلواؤں گا لہٰذا ایک نہ ایک دن مجھے یہ بیچنا پڑے گا۔

اس موبائل کا سب سے مؤثر استعمال یہ ہے کہ اس سے میں سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگاؤں۔ میرا ایک دوست ہے جو ایک بینک میں کام کرتا ہے وہ اکنامکس پڑھا ہوا ہے۔اس نے نوکری چھوڑ دی اور اب بینک کے ساتھ کام کرتا ہے۔اس کی تنخواہ ہے ایک لاکھ اسی ہزار روپے۔اس کے علاوہ بینک اس کو مختلف الاؤنسز میں دیتا ہے ایک لاکھ بیس ہزار روپے اضافی۔گویا اس کی تنخواہ ہے تقریباً تین لاکھ روپے۔اس کے پاس لیپ ٹاپ ہوتا ہے۔وہ بچپن ہی سے سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگانے کا ایکسپرٹ ہے،تو بینک اسے ایک بڑی رقم دیتا ہے جس سے وہ سٹہ لگاتا ہے اور اپنے کام کا اتنا ماہر ہے کہ وہ بینک کو ہر مہینے کروڑوں کما کے دیتا ہے کبھی اس کو نقصان نہیں ہوا وہ ہر ماہ بینک کو کروڑوں کما کے دیتا ہے۔وہ اگر ایک خاص حد سے زیادہ بینک کو کما کر دے تو اس کو اضافی بونس بھی ملتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میاں یہ لیپ ٹاپ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس پر بیٹھ کر تم لوگوں کی تصویریں دیکھتے

رہو۔ اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے کہ تمہارے سر کے اوپر تمہارے ماں باپ کا سایہ قائم ہے اور وہ تمہیں خرچ دیتے ہیں اس لیے تو تم فیس بک استعمال کرنے کی عیاشی کر سکتے ہو۔ لیکن جب باپ مر جائے گا اور تم ہر وقت face book پر تصویریں دیکھتے رہو گے تو بجلی کا بل کہاں سے ادا کرو گے؟ اور اس کے کریڈٹ کارڈ کی ادائیگی کہاں سے کرو گے؟ لیپ ٹاپ دراصل اس لیے ہوتا ہے کہ آپ انٹرنیشنل مارکیٹ کے ساتھ رابطے میں رہو۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ پاکستان کی مارکیٹ میں مندی ہے تو وہ کسی اور مارکیٹ میں پیسے لگا دیتا ہے۔ بینک نے اس کو آزادی دی ہوئی ہے کہ وہ کہیں بھی پیسے لگا سکتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے لیپ ٹاپ اس کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ ۲۴ گھنٹے ایک اذیت میں رہتا ہے۔ وہ میری ہی عمر کا ہے لیکن وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑا لگتا ہے۔ ٹینشن کی گولیاں ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ہر وقت ایک پریشر رہتا ہے کہ اگر پیسہ ڈوب گیا تو کیا ہوگا؟ اور وہ کھلا خرچ کرتا ہے اور ایک اعلیٰ معیارِ زندگی اس نے اپنا لیا ہے اب اس کے گھر والے کم آمدنی پہ گزارا نہیں کر سکتے۔ اس کا ماہانہ خرچ دو ڈھائی لاکھ روپے ہے۔ اب اگر اس کی یہ ملازمت جاتی ہے تو ۴۰، ۵۰ ہزار کی نئی ملازمت میں اس کا گزارا نہیں ہوگا لہٰذا وہ ہر وقت ٹینشن میں رہتا ہے، اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں بم تو نہیں پھٹا، کہیں حالات تو خراب نہیں ہو گئے؟

درحقیقت موبائل ٹیکنالوجی کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ انٹرنیشنل مارکیٹ سے رابطے میں رہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد سے بھی آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ اس کے لیے بنا نہیں۔ تو ٹیکنالوجی جو ہوتی ہے وہ اپنی ویلیوز کے اندر پھلتی پھولتی ہے۔ اگر آپ اس موبائل سے وہ کام لیتے ہیں جس کے لیے یہ بنا ہے تو آپ زیادہ effective ہوں گے، اس موبائل کے اسٹینڈرڈ کو اپنانے اور چلانے میں زیادہ کامیاب ہوں گے۔ اس سے بہتر موبائل خریدنے کے لیے اس موبائل کا وہ استعمال کرنا پڑے گا جو کہ اس کی ویلیو سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس سے اگر آپ لوگوں کے گھروں کے اوپر اذانیں دیتے رہتے ہیں یا نماز کے لیے اٹھاتے رہتے ہیں تو یہ آپ کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو کارڈ خریدتے رہنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ جائنٹ سٹاک مارکیٹ میں پیسے لگاتے ہیں تو پھر آپ کو کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات آپ یاد رکھیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے لیے مارکیٹ سب سے مؤثر میکانزم ہے اور یہ ایک

تاریخی حقیقت ہے۔ چارلس ٹلی(Charles Tilly) اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹیکنالوجی کیوں value Laiden ہوتی ہے، کہتا ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی جو آپ کے سامنے ہے اس نے بدترین بربریت کو چھپا دیا ہے۔ اس کی مثال وہ یوں دیتا ہے کہ فرض کرو تمہارے پاس ایک تلوار ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بڑے بوڑھے تلوار کی باتیں کرتے تھے کہ تلوار سے تم اپنا گلا بھی کاٹ سکتے ہو اور کسی دوسرے کا بھی۔ مطلب یہ کہ ٹیکنالوجی اپنی کوئی ویلیو نہیں رکھتی اس کا اچھا یا بُرا استعمال اسے بُرا بناتا ہے لیکن چارلس ٹلی کہتا ہے کہ ان کو پتا نہیں ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ جب میں تلوار استعمال کرتا ہوں تو فرض کریں کہ میں تلوار سے انسانوں کے ایک جتھے کے اوپر حملہ آور ہوتا ہوں جو نہتے اور بے بس ہیں۔ وہ نہتے بھی ہیں اور وہ بے بس بھی ہیں اور مجبور بھی ہیں کہ بھاگ نہیں سکتے اور میں ان کو تلوار سے مارنا شروع کروں تو چارلس ٹلی کہتا ہے کہ اس ٹیکنالوجی سے براہ راست وہ شخص متاثر ہوگا جو یہ تلوار چلا رہا ہے۔

میرا ہاتھ کسی بزرگ پر پڑے گا، کسی عورت پر پڑے گا، کسی بچے پر پڑے گا، اور جب وہ چیخیں گے تو اس کا اثر میرے ذہن پر بھی پڑے گا، میری روح پر بھی پڑے گا، اور میرے وجود پر پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ میری پوری اخلاقی زندگی اس بہیمانہ عمل کے بعد تبدیل ہوجائے۔ کیوں؟ کیونکہ جو عمل میں کررہا ہوں، جس ٹیکنالوجی کے ذریعے کررہا ہوں اور میں جس میں براہ راست ملوث ہوں جو بربریت میں کررہا ہوں کیا مَیں اس سے متاثر نہیں ہوں گا؟ جب وہ سارے مرجائیں گے اور ان کی لاشیں اور کھلی آنکھیں جو مجھے گھور رہی ہوں گی مجھ پر کیوں اثر انداز نہیں ہوں گی؟ ہوسکتا ہے یہ منظر دیکھنے کے بعد میں اپنے آپ کو چھرا مارلوں۔

کیوں؟ کیونکہ جو ٹیکنالوجی میں نے استعمال کی وہ مجھے زندگی اور اس کے حقائق سے الگ (detach) نہیں کرسکی، روایتی ٹیکنالوجی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ آپ کو اٹیچ کرتی تھی۔ ماڈرن ٹیکنالوجی detach کرتی ہے۔ فرض کریں کہ یہاں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے امریکہ کے بارے میں کچھ بُری باتیں سوچ رہے ہیں اور ان سے امریکہ کے مفادات کو کچھ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو ایک امریکی فلاڈلفیا میں اپنے ائیرکنڈیشنڈ کمرے میں کافی پیتے ہوئے فیصلہ کرے کہ یہ کیا بدمعاشی ہورہی ہے اور ایک کانٹی نینٹل میزائل کا بٹن دبادے اور اس کے بعد ٹیلی ویژن کھول کے گانے سنتا رہے اور وہاں سے بیلسٹک میزائل آئے اور یہاں پر ایک لمحے میں بے شمار بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی

دھجیاں اڑ جائیں۔ اس آدمی کی جو شعوری کیفیت ہوگی اور اس آدمی کی جس نے تلوار سے لوگوں کو مارا تھا دونوں کی شعوری کیفیت ایک جیسی ہوگی یا ہوسکتی ہے؟

آپ کے ہمسائے میں عراق کے اندر ۵ سال میں ۱۲ لاکھ انسان قتل ہوئے کسی کے کان پر جوں تک رینگی؟ پاکستان میں ۳۶ ہزار لوگ مر چکے ہیں، لوگ دیکھ رہے ہیں ، لیکن digitally constructed world نے ہر چیز کو کیموفلیج کر دیا ہے۔ بظاہر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ connect ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت آپ disconnect ہوتے ہیں۔ جب بالاکوٹ میں زلزلہ آیا اور ٹیلی ویژن پر ہم نے اس کے مناظر دیکھے تو مَیں اور میرا بھائی اور اس کے دوست ہم لوگ حسب استطاعت وہاں لوگوں کی مدد کے لیے پہنچے۔ تو ہمیں ایک فوجی پلاٹون کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ہم ان کی مدد کرتے تھے اور جو وہ کہتے تھے وہ کرتے تھے۔ وہ اٹھا کر لے آؤ، یہاں سے کھودو، اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام۔ ہم اٹھارہ دن وہاں رہے۔ میں وہاں پر ابتدائی تین دن کھانا نہیں کھا سکا۔ جب میں وہاں پہنچا تھا تو زلزلہ آئے چھ یا سات دن گزر چکے تھے۔ وہاں پر انسانوں کے جسموں کی بدبو تھی جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سونگھی تھی۔

اب میں کوئی محلوں میں رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ناظم آباد میں پیدا ہوکر پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن ہوجاتے ہیں، تو کوئی high profile life نہیں ہے میری۔ لیکن مَیں کھانا نہیں کھا سکتا تھا اور مجھے الٹی ہوجاتی تھی۔ اتنی بدبو پھیلی ہوئی تھی پورے بالاکوٹ کے اندر۔ زلزلے کے بعد جو بھی بالاکوٹ گیا ہے وہ میری بات کی تصدیق کرے گا۔ وہاں میں نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ بھائی یہ اس قدر بو کس چیز کی ہے؟ تو اس نے کہا کہ یہ انسانوں کے جسموں میں سے آرہی ہے جو اندر پھنسے ہوئے ہیں، مرگئے ہیں۔ تو میں کھانا کھانے کے لیے پہاڑ سے نیچے اترتا تھا، کافی نیچے اترتا تھا، تب بھی مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ وہاں پر ایک پودا ہوتا تھا اس کا پتہ توڑ کر ہاتھوں پر ملنے سے اس میں سے تیز دھنیے جیسی خوشبو آتی تھی تو پھر میں کھانا کھاتا تھا۔ لیکن ٹی وی پر بیٹھ کر جو لوگ دیکھتے تھے کہ کچھ لوگ وہاں پر جاتے تھے غبارے اور کیک لے کر، بچوں کے کیمپوں میں۔ ایک بچے کی ماں مرگئی، اس کے باپ، بھائی سارے مرگئے۔ وہ بچہ کانپتا سسکتا وہاں بیٹھا ہے۔ یہ اس کی برتھ ڈے منانے کے لیے آگئے کیک لے کر، بڑی بڑی ٹوپیاں اور غبارے لے

کر، کیمرے پر ان کی تصویریں بن گئیں، دنیا دیکھ رہی ہے۔

بھئی! یہاں انسان سے روٹی نہیں کھائی جارہی اور تم کیک لے کر آ گئے ہو؟ تم انسان کے بچے ہو، کون ہو تم؟ کوئی نہیں ہم ان کی خوشیوں میں شریک۔۔۔ابے خوشی کی کیا بات ہے۔ کون سی خوشی منانے کا وقت ہے یہ؟ اس کا پورا خاندان مر گیا، تم خوشی منانے آ گئے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تصویریں کھنچوانے کے لیے میک اپ کر کے آ گئے ہو؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹی وی پر سنتے اور دیکھتے تھے یہ چیزیں ان کو بد بو تھوڑی آتی تھی؟ انہوں نے ٹھنڈے انسانی جسموں کی گانٹھیں اٹھائی ہیں؟ مرے ہوئے آدمی کو اٹھانے کا تجربہ کیا ہوتا ہے؟ ہاتھ کانپ جاتے ہیں بڑے بڑے مضبوط لوگوں کے! ایک بچہ تھا جس کا ایک ہاتھ باہر رہ گیا تھا، دھڑ دب گیا تھا، ہم نے نکالنا شروع کیا وہ پتا نہیں کس Structure میں دبا پڑا تھا۔ صبح سے میں نے کھودنا شروع کیا، شام تک کھودتا رہا اور میں وہ نہیں نکال سکا بچے کو کھینچنے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں جب یہ ہاتھ لے کر واپس آیا تو وہاں ایک آرٹسٹ تھی جو ٹوپی پہن کر بچوں کو لطیفے سنا رہی تھی۔ بتانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ اس طرح دیکھنے کا تجربہ اور ہوتا ہے اور محسوس کرنے کا تجربہ کچھ اور! خلاصہ یہ کہ جب آپ technological driven life گزارتے ہیں تو وہ آپ کو detach کرتی ہے۔

ٹیکنالوجی کے خلاف ہم جب بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تمام پاکستانی پتھر کے زمانے میں چلے جائیں۔ کیونکہ جب آپ ٹیکنالوجی پر تنقید کرتے ہیں تو پاکستانیوں کو اونٹ کی پیٹھ نظر آجاتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ آپ خود جا کر اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ! تو آپ کو اونٹ کی پیٹھ کر بیٹھنے کو کوئی نہیں کہہ رہا۔ لیکن آپ اس ٹیکنالوجی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ یہ قدر نہیں ہے کیونکہ ٹیکنالوجی کی قدر کا تعین مارکیٹ کرتی ہے، یہ آپ کو کس نے بتایا کہ یہ مہنگا ہے اور جو مہنگا ہوگا وہ زیادہ اچھا ہوگا۔ یہ جو 'مہنگا ہوگا تو وہ اچھا ہوگا' کی قدر کا تعین کون کر رہا ہے؟ قدر کا تعین کر رہی ہے مارکیٹ۔

جب آپ technological driven life world میں جاتے ہیں تو آپ کی قدر بنتی ہے سرمایہ۔ معیارِ زندگی کی بہتری اور جمع سرمایہ باہمی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ فی زمانہ technologically driven life world اور احیائے اسلام کو جو لوگ مربوط اور جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کو contradict کرتے ہیں اور جو ویلیوز اس کے

نتیجے میں پروموٹ ہوتی ہیں وہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ویلیوز ہوتی ہیں۔سرمائے کی بڑھوتری کو بنیادی ویلیو کے طور پر قبول کیے بغیر ٹیکنالوجیکل گروتھ ہو ہی نہیں سکتی۔

اور یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ٹیکنالوجی انسانوں کی زندگیوں میں کوئی بہتری لاتی بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہوزے ماریہ سبرٹ یا سٹیلس سٹیریو وغیرہ جیسے ٹیکنالوجی کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک تو ٹیکنالوجیکل ڈویلپمنٹ کے پروسیس میں پڑے ہی نہیں۔وہ ٹیکنالوجی میں Development نہیں کرتے بلکہ redevelopment کرتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز کو ڈویلپ کرتے ہیں جو مغربی دنیا میں تیس سال پہلے ڈویلپ ہو چکی تھی اور اب وہاں متروک ہو چکی ہے لیکن یہ اسے ڈویلپمنٹ کے نام سے اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جب وہ کوئی ٹیکنالوجی اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں اعلیٰ، جدید اور طویل تحقیق کا نچوڑ حالانکہ وہ مغرب میں متروک ہو چکی ہوتی ہے۔جب ایک کمپیوٹر تیسری دنیا میں مارکیٹ میں آ رہا ہوتا ہے تو اس وقت مغرب میں اس کی ٹیکنالوجی متروک(obsolete) ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد کا جو ماڈل ہوتا ہے وہ technology consistant ہوتا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجیکل گروتھ نے انسانوں کی زندگی کے مسائل کو حل کیا ہے۔کوپن ہیگن میں دسمبر ۲۰۰۹ء میں ایک کانفرنس ہوئی ۔ اس کے احوال پر میں بات ختم کروں گا۔ اس کانفرنس میں بہت سارے پوسٹ ماڈرن مفکرین نے مل کر یہ مسئلہ اٹھایا کہ ٹیکنالوجی پروڈیوس کرنے کی وجہ سے دنیا کا جو ٹمپریچر بڑھ رہا ہے اس کی وجہ سے فطرت کی تباہی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اگلے پچاس سال کے اندر دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہے گی؟ لہٰذا ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دنیا کی تمام ریاستوں کو مل کر over all Temprature کو چار ڈگری نیچے لانا چاہیے تاکہ انسانیت کو مزید پچاس سال مل جائیں جس میں وہ sustainable development کے کوئی دوسرے متبادل میکانزم ڈویلپ کرسکیں۔اس کانفرنس میں امریکہ بھی تھا، یورپ بھی تھا۔چین اور بھارت وغیرہ سب تھے۔اس معاہدے پر کسی نے بھی دستخط نہیں کیے۔ انہوں نے کہا دنیا اگر تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ کیونکہ ٹمپریچر چار ڈگری نیچے لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی ٹیکنالوجیکل ترقی کے پراسس کو آہستہ (slow down) کرنا پڑے گا اور اگر ہم ایسا

کریں تو ہم نے جو سرمایہ اس پر لگا یا ہوا ہے وہ ہمیں کون دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ چین اور بھارت دونوں کے پاس انتہائی ردی قسم کی ٹیکنالوجی (obsoleted technology) ہے جو بہت آلودگی پیدا کرتی ہے۔ تو چین نے کہا ٹھیک ہے ہم اپنی ٹیکنالوجی بند کر دیتے ہیں آپ ہمیں اتنے بلین ڈالر دیں جو ہم سرمایہ کاری کر چکے ہیں۔ اس پر مغربی ممالک نے کہا ہم تو نہیں دیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا تو ہم بند نہیں کریں گے، دنیا جائے بھاڑ میں ہمیں اس سے کیا سروکار؟۔ ویسے بھی اس ایوان کے اندر جتنے لوگ ہیں وہ پچاس سال تک زندہ نہیں رہیں گے لہٰذا اس کے بعد دنیا میں کیا ہوتا ہے اس کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔

جو پوسٹ ماڈرن دانشور کوپن ہیگن کانفرنس کی صدارت کر رہی تھی اس نے وہ مسودہ پھاڑا اور کانفرنس سے اٹھ کر چلی گئی اور اس نے کہا کہ لوگوں نے ترقی کو انسانیت کے مستقبل پر ترجیح دی ہے لہٰذا اس دنیا کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اور یہ بات اس نے ہی نہیں کہی ایک مشہور ملحد فلسفی تھا ہائیڈیگر اس نے ۱۹۲۶ء میں ایک کتاب لکھی تھی '*Essay Concerning Technology*'۔ اس سے کسی نے پوچھا تھا کہ یہ ٹیکنالوجی کا جو عفریت کھڑا ہو گیا ہے اس کا کوئی حل ہے یا نہیں ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس ٹیکنالوجی کے عفریت سے دنیا کو صرف خدا بچا سکتا ہے حالانکہ وہ خود خدا کو نہیں مانتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ یہ بُرائی کا ایسا چکر ہے جس میں پڑتا تو آسان ہے لیکن اس سے نکلا نہیں جا سکتا۔ یہ ایسا کمبل ہے جس کو اوڑھنا تو آسان ہے لیکن پھر یہ کمبل آپ کو چھوڑتا نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو ٹیکنالوجیکل ترقی میں شامل ہی نہیں یہ تو یورپ participate کر رہا ہے لہٰذا ہمیں کیا؟ ہم تو ہمیشہ محکوم ہی رہیں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجیکل ترقی کے پروسیس کو slow down کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بُرے consumer بن جائیں اگر آپ ایک بُرے consumer بن جاتے ہیں تو انٹرنیشنل گلوبل اکانومی ڈوب جائے گی۔ ایک بڑا مشہور اکانومسٹ کہتا ہے کہ اگر ایک مہینے تک ایک بڑی تعداد میں لوگ consumption کے پروسیس سے اپنے آپ کو detach کر لیں تو پروڈکشن کا عمل تو مستقل پروڈیوس کیے جا رہا ہے ناں! یہ مرغیاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ایک خاص قسم کی ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہ مسلسل انڈے دیتی رہتی

ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ یہ انڈے دینا بند کردیں تو یہ نہیں ہوسکتا وہ انڈے دیتی رہیں گی۔ جو بھی ٹیکنالوجی پروسیس کے اندر ہے اس کو اگر آپ نے slow down کرنے کی کوشش کی تو اس کے price mecanism ڈسٹرب ہوجائیں گے اور پوری انٹرنیشنل مارکیٹ بیٹھ جائے گی۔

توجو لوگ غلط امریکی پالیسوں کی وجہ سے اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے شکست دینا چاہتے ہیں انہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے لیے انہیں امریکہ پر میزائل اور بم مارنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس پر اس پہلو سے حملہ کرنا چاہیے جس کا وہ دفاع بھی نہ کرسکے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس کی سرمایہ دارانہ ویلیوز کی پیروی کرنا چھوڑ دیں اور اس کی ٹیکنالوجی مصنوعات کی خرید بند کردیں۔ دیکھیے! امریکہ آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ pizza hut میں جاکر ہزار روپے کی روٹی کھاؤ جبکہ آپ کے ملک میں پانچ

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے خصوصی تعاون 10,000روپے

نام... پتہ...

....

فون نمبر... ای میل...

چیک بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اور منی آرڈر بنام مدیر انتظامی ، 71-A فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے۔

روپے کی روٹی مل رہی ہے اور وہ آپ سے یہ نہیں کہتا کہ ڈیڑھ کروڑ روپے کی گاڑی میں بیٹھو۔

جب آپ یا تیسری دنیا کے کسی ملک کا کوئی شہری 1600cc کی گاڑی خریدتا ہے تو چارلس ٹلی کہتا ہے کہ اس کی لوکل آبادی، اگر وہ زراعت پر مبنی معیشت رکھتی ہے جیسے کہ پاکستان کی ہے، تو سو گھرانے ڈھائی من کی گندم کی بوری سے محروم ہو جائیں گے۔ سو خاندانوں کو آٹے سے محروم کرنے کے بعد وہ گاڑی خریدتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے ان پر ڈاکہ تھوڑی ڈالا ہے۔ تو بے شک آپ نے ڈاکہ نہیں ڈالا لیکن آپ ایک ٹیکنالوجی استعمال کر رہے ہیں جو آپ نے نہیں بنائی تو آپ اس کی قیمت کہاں سے ادا کرو گے؟ اپنے لوگوں کا گلہ کاٹ کر تو ہی ادا کرو گے۔

اگر آپ کہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تو سمجھیے کہ گاڑی کوئی آم کے پیڑ پر نہیں اُگتی کہ آپ جا کر توڑ لائیں گے۔ گاڑی بنانے کے لیے انسان کو ہزاروں طرح کی آلودگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کے لیڈر سے کوئی پوچھے کہ میاں جنت کا تصور کیا ہے تو وہ کہے گا جنت کا تصور یہ ہے کہ موٹر وے ہو بہت بڑی سی اور میں اس میں لیموزین چلاتے ہوئے جا رہا ہوں۔ اگر اُس کا دماغ اِس طرح کام کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ عام آدمی کا دماغ کس طرح سے کام کرے گا؟

خلاصہ یہ کہ مغرب کی ٹیکنالوجیکل ترقی کے میکانزم کو اگر آپ اسلحے کی بنیاد پر شکست دینا چاہتے ہیں اور اسلحے کے میدان میں ٹیکنالوجیکل پر کام کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی آپ کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر مغرب کو شکست دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ویلیوز کی نقل کرنا چھوڑ دیں۔ اگر آپ کی ویلیوز وہی ہیں، اگر آپ بھی وہی چاہتے ہیں جو وائٹ ہاؤس کے اندر بیٹھا ہوا آدمی چاہتا ہے تو پھر لڑائی کس بات کی ہے؟ پرابلم کیا ہے؟ لیکن اگر آپ فرعون کا طرزِ زندگی اور موسیٰ کی آخرت چاہتے ہیں تو یہ دونوں چیزیں ناممکن ہیں۔ دونوں ایک ساتھ نہیں ملیں گی۔ حضرت شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہو اور یوں بھی، یہ نہیں ہو سکتا۔

وقت کی کمی کی وجہ سے میں تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ خالد جامعی صاحب نے اس موضوع پر ۱۸۰۰ صفحات لکھے ہیں اور جتنے ممکنہ اعتراضات ہو سکتے ہیں ان کے جوابات دیے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ موجودہ ٹیکنالوجی کا استعمال فوراً بند کر دیں اور اسے توڑ کر پھینک دیں اور مجھے کہیں کہ سوری صاحب! آپ خود پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف وہی پرانے اور گھسے پٹے

دلائل دہرا رہے ہیں۔ بھائی! اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی چکی کا آٹا کھایا تھا جوفرعونی تہذیب کی پیداوار تھی لیکن انہوں نے فرعون کی طرزِ زندگی کو آئیڈیلائز نہیں کیا تھا اور جب ان کو موقع ملا انہوں نے اس طرزِ زندگی کو الٹا کے رکھ دیا۔ انہوں نے اہرام مصر نہیں توڑا لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ چلو ہم اسے لائبریری بنا دیتے ہیں۔

مسلمان جب بحیرۂ روم کے پاس پہنچے ہیں تو انہوں نے کہا یہ کس طرح کے لوگ تھے جو پہاڑوں میں اس طرح کی محفوظ زندگی گزارنے کے باوجود مارے جا رہے ہیں۔ تو اس سے وہ یہ سمجھے کہ تحفظ کے لیے پہاڑوں کے اندر رہنا بھی بیکار ہے اور یہ طے کیا کہ وہ میدانوں کے اندر رہ کر ہی اپنا تحفظ کریں گے اور دشمن کو شکست دیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر وہی طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ اور یورپ اختیار کیے ہوئے ہیں تو پھر آپ کو ان کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اپنی ویلیوز لے کر آتی ہے۔ یہ دیکھیے کہ مشرقی اور مغربی یورپ میں اتحاد کی تحریک کیسے چلی! جب مشرقی یورپ کے لوگوں نے دیکھا کہ مغربی یورپ کے لوگوں نے خوب ترقی کر لی ہے تو انہوں نے سوچا کہ ہم بھی ان کی ٹیکنالوجی کو اپنا لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں بھی ایسی ہی ترقی ہو جائے گی۔ اس کے لیے انہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی ان سے لی۔ انہوں نے جیسے ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی مغربی یورپ سے لی تو انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایسے مالی ادارے ہونے چاہئیں جو اس ٹیکنالوجی ٹرانسفر میں مدد دیں تو مشرقی یورپ والوں نے سوچا کہ چلو چند ایک مالی ادارے بنا لیتے ہیں جو مشرقی اور مغربی یورپ کے مابین ٹیکنالوجی ٹرانسفر میشن کو ممکن کر سکیں۔ لیکن ان اداروں کے ذریعے بالآخر پوری سوسائٹی ٹرانسفر ہو گئی اور انہوں نے کمیونسٹوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ مشرقی یورپ کی آبادی کا اوسط طرزِ زندگی ۱۹۲۴ء یعنی پہلی جنگ عظیم کے بعد سے لے کر ۱۹۸۲ء تک صرف چودہ فیصد بڑھا تھا۔ انہوں نے جب مغربی یورپ کو دیکھا تو سوچا کہ ہمیں بھی ایسی ترقی چاہیے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ ترقی تمہیں ملے گی competitive life world کی بنیاد پر چنانچہ وہ مان گئے کہ انہیں free competition چاہیے۔ میں کیوں لائن میں لگ کے انتظار کروں؟ بلکہ جس میں دم ہے وہ لے لے۔ یوں انہوں نے کہا کہ ہمیں اصول مساوات کی بنیاد پر ٹیکنالوجی نہیں چاہیے بلکہ

efficiency کی بنیاد پر چاہیے۔ efficiancy تو سب کے اندر برابر نہیں ہوتی، جس کی جتنی efficiency ہو وہ اتنی ٹیکنالوجی مغربی یورپ والوں سے لے لے۔اس کے نتیجے میں کیا ہوا؟ مشرقی یورپ اورمغربی یورپ ایک ہی نتیجے پر جمع ہوگئے۔ اگر آپ بھی وہی ٹیکنالوجی استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کوبھی انہی ویلیوز پر جمع ہونا ہوگا (جاری ہے)۔

تزکیۂ نفس — امام ابن قیمؒ

روزہ۔تزکیۂ نفس کا مؤثر ذریعہ

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس کو اس حد تک قابو کیا جائے کہ وہ خواہشات کی تکمیل سے رکنے کی تربیت پائے اورلذت کی وہ بہت سی صورتیں جو اس کے منہ کو لگ چکی ہوں، ایک اعلیٰ مقصد کی لگن میں اس سے چھڑوا دی جائیں۔ اس کے حیوانی قویٰ کو قابو میں لایا جائے اور اس کی شہوانی توانائی کو اعتدال سکھایا جائے۔نفس کی چاہت کو مادی مطالب سے پھیر کر ایک اعلیٰ و پاکیزہ رُخ دیا جائے۔ اس میں وہ سلیقہ پیدا کیا جائے کہ یہ کسی اور جہان کی جستجو کر سکے جہاں لطف کی کوئی انتہا نہیں اور جہاں نعمتوں اور آسائشوں کا کوئی اندازہ نہیں اور جہاں عیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ یہ ان خوبیوں سے آراستہ ہوسکے جو دائمی زندگی پانے کا ایک مناسب ترین مقدمہ بن سکیں۔

چنانچہ روزے سے مقصود یہ ہے کہ دنیا کی بھوک پیاس کی نفس میں کچھ خاص وقعت نہ رہے اور نہ یہاں کا کھانا پینا ہی اس کا منتہائے سعی رہے۔۔۔تاکہ یہ احساس کی وہ صلاحیت بھی پالے جس کی بدولت اس کو اندازہ رہنے لگے کہ ایک بھوکے مفلس کے کلیجے پہ کیا گزرتی ہے اور مسکین کے دل کی کیا حالت ہوا کرتی ہے۔

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ جسم میں شیطان کی بھاگ دوڑ کے لیے راستے تنگ کر دیے جائیں اور کھانے پینے کی راہ سے شیطان کو یہاں جو گزرگاہیں میسر آتی ہیں وہاں اس کا گزر دشوار کر دیا جائے۔۔۔قوائے جسم کی آزادی ذرا محدود کر کے، اور بدن کا جوش ذرا کم کر کے، روح کو معبود کے راستے میں تحریک دی جائے۔ پس یہ متقیوں کے لیے ایک زورآور جہاد ہے اور مجاہدوں کے لیے ایک زبردست ڈھال۔ یہ نیکوکاروں کی ریاضت ہے اور خدا کا قرب پانے والوں کے لیے محنت کا ایک بڑا میدان۔

روزے کو سارے اعمال میں سے 'خدا کی خاطر' ہونے کی وجہ سے ایک خاص نسبت حاصل ہے کیونکہ روزہ دار اپنی خواہش اور اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے پینے کو معبود کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ پس یہ محبوباتِ نفس کو خدا کی محبت میں بھلا دینا ہے اور نفس کی لذتوں کو خدا کی خوشنودی پر وار دینا ہے۔ گویا یہ نفس کا ایک محبوب سے پھر کر ایک دوسرے محبوب کو اختیار کر لینا ہے۔ پس یہ روزہ محبوب کا ایک شعوری اور ہمہ وقتی تعین ہے۔ بندے اور خدا کے مابین ایک راز ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو بندے کو معلوم ہے یا پھر خدا کو! لوگ زیادہ سے زیادہ دیکھ سکتے ہیں تو یہ کہ یہ بندہ اپنا کھانا پینا اور دیگر مفطرات کو چھوڑ کر بیٹھا ہے۔ مگر دل کی وہ حالت جو اس سے اس کا یہ کھانا پینا اور اس کی یہ شہوت وخواہش چھڑوائے بیٹھی ہے اور معبود کی طلب میں جائز خواہشِ نفس کو قربان کروا رہی ہے، صرف خدا کو معلوم ہے۔ اس کی کوئی اور کیوں خبر پا سکتا ہے۔۔۔ روزہ کی اصل حقیقت سمجھو بس یہی ہے!

انسان کے ظاہر و باطن کو بدل کر رکھ دینے میں روزے کی عجیب تاثیر دیکھی گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ جسم کے فاسد مادے اس ریاضت سے دھل جاتے ہیں بلکہ روح کے ناگوار پہلو بھی اس عبادت سے خوب صاف ہوتے ہیں۔ قلب اور جوارح کے صحت پانے میں روزہ کی تاثیر دیدنی ہے۔ نفس کے وہ حصے جو خواہشات وشہوات کے زیر آب آ چکے ہوتے ہیں، وہ اس عمل کے نتیجے میں بخوبی واگزار کرا لیے جاتے ہیں اور بندگی کو اس سرزمین پر پیر جما کر چلنے میں خوب مدد ملتی ہے۔ دل میں تقویٰ کی راہ ہموار کرنے میں 'روزہ' کو عبادات کے مابین ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** [183:2]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کیے جاتے ہیں جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے، شاید کہ تم تقویٰ پاؤ''۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: 'الصوم جُنة' یعنی روزہ ڈھال ہے۔

علاوہ ازیں جنسی خواہش کو قابو میں لانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزہ تجویز فرمایا۔ غرض عقل اور فطرت کو نفس کی اصلاح میں روزہ کی اس غیر معمولی تاثیر کا جو مشاہدہ کرنے کو ملتا ہے اس کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اس عبادت کو انسانوں کے لیے مشروع ٹھہرا دیا۔۔۔ پس یہ اس کی رحمت ہے اور ان پر اس کا ایک احسان اور بُرائی سے ان کا ایک زبردست تحفظ۔

پس روزہ یہ ہے کہ وہ حلال لذتیں بھی جو نفس کے منہ کو لگ چکی ہوں اور وہ جائز آسائشیں بھی

۲۰۱۱ء

جن کا یہ نفس عادی ہوچکا ہو۔۔اس سے پرے کردی جائیں اور کچھ عرصہ اس پر یہ حالت گزرے اور اس کیفیت میں اس کو خدا کی جانب متوجہ کرایا جائے تا کہ یہ بندگی کے کچھ خاص پاکیزہ معانی از بر کرے اور پورا ایک ماہ یہ اسی حالت میں صبح سے شام کر دیا کرے۔

منہ کو لگ چکی یہ لذتیں اور آسائشیں چھڑا دینا چونکہ آسان کام نہ تھا لہٰذا اس کی فرضیت نازل ہونے سے خاصی دیر تک رکی رہی۔ یہ فرض ہجرت کے بھی کچھ دیر بعد نازل ہوا۔نفوس کے اندر جب توحید گہری اتر چکی اور پھر نماز نے ان موحد نفوس کو ایک بندگانہ صورت دے دی اور قرآن سے حکم لینے پر کچھ تربیت پا لی تب بتدریج ان کو بندگی کی اس صورت کی جانب لایا گیا۔

ہماری سرگرمیاں

اسد محمود کاشمیری
سراج محمود ناصر

دوروزہ قومی تعلیمی کانفرنس

مختصر روداد

تحریک اصلاح تعلیم کے ادارے صفاء انسٹی ٹیوٹ نے ۲۳، ۲۴ جولائی ۲۰۱۱ء کو دوروزہ قومی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہمدرد کانفرنس سنٹر لٹن روڈ لاہور میں کیا۔ اس کانفرنس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ دینی ضرورت اور عملی تقاضوں دونوں لحاظ سے ہمارے معاشرے کی اس وقت ضرورت یہ ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی اصولوں اور تقاضوں کے مطابق ہو اور اس میں بچوں کی اسلامی تربیت کا خصوصی اہتمام ہو۔ اس غرض سے ایسے سکولوں کے پرنسپل/ ڈائریکٹر حضرات کو دعوت دی گئی تھی جو اپنے اداروں میں تعلیم وتربیت کے اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور حتی المقدور ان پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔

کانفرنس کا اسلوب یہ رکھا گیا تھا کہ شریک ہونے والے تعلیمی اداروں کے سربراہان کو اسلامی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اپنے اپنے وژن اور تجربات کے اظہار کا موقع ملے تا کہ لوگ ایک دوسرے کے عملی تجربات سے استفادہ کرسکیں۔ اسی طرح تقریریں اگرچہ مختصر رکھی گئی تھیں (ہر تقریر کا دورانیہ آدھا گھنٹہ تجویز کیا گیا تھا) لیکن ان پر سوال وجواب کے لیے زیادہ وقت دیا گیا تھا۔ لیکچرز کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے موجودہ نظام تعلیم کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، پھر اس کی اصلاح کی حکمت عملی پر

گفتگو کی جائے اور پھر اصلاح کے اہم اصولوں یعنی نصاب، تربیت اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ کی تربیت اور طلبہ کی کردار سازی پر شرکاء کو اطمینان سے سننے، سوچنے اور کہنے کا وافر موقع ملے۔ الحمدللہ! یہ سب کچھ ہوا اور شرکاء نے دو دنوں تک جم کر ان موضوعات پر غور کیا اور گفتگوئیں کیں۔

پہلے دن یعنی ۲۳ جولائی کے افتتاحی اجلاس کی صدارت لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان صاحب نے کی جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ سپریم کورٹ کے اس شریعت اپیلیٹ بنچ کے چیئر مین تھے جس نے سود کو خلاف شریعت قرار دیا تھا اور آپ ان چند ججوں میں سے ایک تھے جنہوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار پر ریٹائرمنٹ قبول کر لی تھی۔ تلاوت قرآن حکیم کا اعزاز قاری عطاء الرحمن صاحب نے حاصل کیا جنہوں نے خوبصورت انداز میں تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ والی آیات اور ان کا ترجمہ شرکاء کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد تحریک اصلاح تعلیم کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے کانفرنس اور ادارے کے مقاصد شرکاء کے سامنے رکھے اور بتایا کہ ان کا ادارہ پچھلی ربع صدی سے تعلیمی اصلاح کے لیے سوچ بچار اور مقدور بھر عملی جدوجہد کر رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پیش نظر شروع ہی سے دو مقاصد تھے: ایک یہ کہ موجودہ نظام تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح کی جائے اور دوسرے نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان کے بعد پروفیسر عبدالصمد صاحب نے موجودہ نظام تعلیم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر صاحب عمر بھر تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں اور یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی کی فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ڈین اور شعبۂ تعلیم کے سربراہ کی حیثیت سے پچھلے سال (دوسری بار) ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا نظام تعلیم نظریاتی جہت سے عاری ہے اور ہمارے حکمرانوں، بیوروکریسی اور تعلیمی ماہرین نے مغربی تہذیب کی اندھی پیروی ہی کو تعلیم وتربیت کی معراج سمجھ لیا ہے۔ (خصوصاً انگریزی ذریعہ تعلیم، غیر ملکی امتحانات اور تربیت کے مغربی انداز اس کا طرۂ امتیاز ہیں) حالانکہ مغرب کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے سراسر دھوکے اور دشمنی پر مبنی ہے لہٰذا ہمیں عقل کے ناخن لینے چاہئیں اور اپنی زبان (اردو) اور اپنی ثقافت کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔ سوال وجواب کی نشست کے بعد جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ایک جاپانی ماہر تعلیم کے حوالے

سے گفتگو کی اوراس کے بیان کردہ اصولوں کواسلامی تعلیمات کے مطابق قرار دیتے ہوئے انہوں نے حسن خُلق (courtesy)، حسن انتظام (management)، تجزیاتی ذہن(analytical mind) جنس و منشیات سے آگاہی (sex and drug education) اور معاشرتی حقوق و واجبات کی اہمیت پر زور دیا۔

اس کے بعد نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوا اور دوسرے سیشن میں بعض شرکاء کانفرنس نے 'اسلامی سکول: میرا وژن اور تجربات' کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر دوسروں سے شیئر کیا اور ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے 'موجودہ نظام تعلیم: اصلاح کی حکمت عملی' کے عنوان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نظام تعلیم میں دو بنیادی خرابیاں ہیں: ایک تو وہ عصری اسلامی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور دوسرے وہ مغربی تہذیب کی اندھی نقالی پر مبنی ہے جس کا ایک بڑا مظہر تعلیمی ثنویت ہے یعنی دینی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ ہے حالانکہ اس سیکولرزم کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے ہی نہیں اور مسلمانوں کا نظام تعلیم ہمیشہ موحد (Integrated) رہا ہے جو بیک وقت دین و دنیا کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ انہوں نے کہا دینی مدارس کو جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرانا چاہیے اور جدید تعلیم میں ضروری دینی تعلیم و تربیت شامل ہونی چاہیے اور مغربی تہذیب کے مظاہر (انگریزی ذریعۂ تعلیم، غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی نصابی کتب، او اور اے لیول کے امتحانات اور ہم نصابی سرگرمیوں میں مغرب پرستی) کی پیروی سے گریز کرنا چاہیے۔ انہوں نے موجودہ درس نظامی اور مغرب زدہ جدید تعلیم کے مقابلے میں ایسے نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں (سکول، کالج، یونیورسٹی اور دینی مدارس) کے قیام کو ضروری قرار دیا جو موجودہ تعلیمی دھاروں کی خامیوں سے پاک ہوں۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تقریر نے کئی بحثیں چھیڑ دیں جو تیسرے سیشن میں بھی جاری رہیں جس کے مہمان خصوصی مشہور صحافی اور کالم نگار عامر خاں خاکوانی تھے۔ انہوں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کو پنجاب میں ابتداء سے اور پانچویں اور آٹھویں کے امتحان میں لازمی قرار دینے کے حکومتی فیصلے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو کم از کم متبادل ذریعہ تعلیم و امتحان تو باقی رہنے دینا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک اسلامی سکول بہتر رزلٹ نہیں دیں گے اور عام

سکولوں سے بہتر افراد پیدا کر کے نہیں دکھائیں گے جو دنیاوی لحاظ سے بھی کامیاب ہوں، محض اسلام اور اردو کے نعرے سے مقابلے کی یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مقابلے کے امتحانات میں ذریعۂ اظہار اردو ہوجائے تو اس سے سول سروس میں آنے والوں کے ٹائپ اور مزاج

دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس کی قراردادیں

قرارداد 1 تعلیم کو صوبوں کے سپرد کرنا

قومی یک جہتی کے فروغ اور ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم خصوصاً نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رہے لیکن صوبوں کی خودمختاری کے نام پر اٹھارویں ترمیم کے تحت یہ کام صوبوں کے سپرد کردیا گیا ہے جو خدشہ ہے کہ انتہائی ضرر رساں ثابت ہوگا اور اس سے قومی یک جہتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس لیے دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس کے شرکاء ارکانِ پارلیمنٹ اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فیصلے کو فی الفور منسوخ کیا جائے اور تعلیم خصوصاً نصاب سازی کا شعبہ مرکزی حکومت کے حوالے کیا جائے۔

قرارداد 2 پنجاب میں انگریزی ذریعہ تعلیم

کانفرنس کے شرکاء نے نوٹ کیا کہ پنجاب حکومت نے نہ صرف پہلی جماعت سے انگلش میڈیم کو لازمی قرار دیا ہے بلکہ پانچویں اور آٹھویں کے امتحانات بھی انگلش میڈیم میں لازمی کردیے ہیں جب کہ قرآن حکیم اور عربی زبان کو آپشنل قرار دے دیا ہے۔

کانفرنس کے شرکاء نے حکومتِ پنجاب کے ان فیصلوں کو نامناسب قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان فیصلوں کو فی الفور منسوخ کیا جائے۔ قرآن حکیم اور عربی کی لازمی حیثیت برقرار رکھی جائے۔ انگریزی زبان کی تدریس پہلے کی طرح چھٹی جماعت سے شروع کی جائے اور پانچویں اور آٹھویں کا امتحان انگریزی کے ساتھ اردو میڈیم میں دینے کی اجازت بھی دی جائے۔ پاکستانی بچوں کو انگریزی پڑھانے پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن انگریزی کو پہلی جماعت سے ذریعہ تعلیم بنانا محض مغرب کی غلامی کو فروغ دینے کا سبب بنے گا۔ اس سے ڈراپ آؤٹ میں اضافہ ہوگا اور قوم جہالت میں مزید ترقی کرے گی۔

کے لحاظ سے کافی فرق پڑے گا۔

چوتھی نشست تربیت طلبہ پر تھی۔ اس نشست کے مہمان خصوصی جناب احمد جاوید صاحب ناسازیٔ طبع کی بناء پر تشریف نہ لا سکے چنانچہ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تربیت کے حوالے سے پیدا ہونے والے اہم سوالات اور مباحث کا ذکر کرنے کے بعد شرکاء سے درخواست کی کہ وہ ان سوالات اور مباحث پر غور فرمائیں تاکہ ان کے بارے میں کل سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ نماز عشاء اور کھانے کے بعد پہلے دن کی سرگرمیوں کا اختتام ہوا۔

۲۴ جولائی اتوار کو پہلا سیشن صبح ۰۸:۳۰ بجے شروع ہوا۔ قاری عطاء الرحمن صاحب کی تلاوت کے بعد مرزا عزیز احمد صاحب نے 'اسلامی سکول کا نصاب کیسا ہونا چاہیے؟' کے موضوع پر گفتگو کی۔ مرزا صاحب سکول سطح پر تدریس کا عمر بھر کا تجربہ رکھتے ہیں اور انہوں نے عرب امارات میں کئی اسلامی انٹرنیشنل سکول از ابتداء تا عروج چلائے ہیں۔ مرزا صاحب نے اچھے نصاب کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ نصابی کتب قومی زبان میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم و امتحان بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے لیکن اس کے لیے محنت کرنا ہوگی۔ اگر آپ کا سکول اردو میڈیم ہو لیکن آپ کے طلبہ کو انگریزی بہت اچھی آتی ہو، اتنی اچھی کہ وہ معروف انگریزی میڈیم سکولوں کے طلبہ کو انگریزی مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں ہرا سکیں اور آپ ایسا فرد تیار کر سکیں جو دنیاوی لحاظ سے بھی انگریزی سکولوں سے پیچھے نہ ہو تو ایسے اردو میڈیم سکولوں کے بارے میں معاشرے کا رجحان آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہو جائے گا۔ مرزا صاحب سے سوال و جواب کی نشست کے بعد پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے 'تربیت طلبہ میں اساتذہ کا کردار' کے موضوع پر گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر استاد طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھے تو پھر ہی ان کے اندر وہ من چاہی تبدیلی لا سکتا ہے لہٰذا استاد کا کام محض تدریس (teaching) نہیں بلکہ mentoring یعنی تعمیر سیرت یا شخصیت سازی بھی ہے۔ انہوں نے کینیا کے ایک گاؤں کی مثال دی کہ کس طرح ایک معمولی سے مضافاتی سکول کے غریب بچوں کو ان کی استاد نے معاشرے کے کامیاب ترین افراد بنا دیا صرف اس وجہ سے کہ وہ خاتون استاد بچوں سے محبت کرتی تھی اور ان کی حقیقی خیر خواہ تھی اور ان کا مستقبل بنانا چاہتی تھی۔ انہوں نے پرنسپل/

☆ مدیر ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ و ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان

ہیڈ ماسٹر کے کردار کا بھی ذکر کیا کہ وہ کس طرح کامیاب اساتذہ کی گرومنگ میں اہم کردار ادا کرسکتا

> ہمیں موبائل فون کے ذریعے بھیجے جانے والے مختصر پیغامات (SMS) ناپسند ہیں کیونکہ یہ ہماری دینی اور لسانی اقدار کو تباہ کرر ہے ہیں مثلاً: ۱۔ خط یا پیغام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا، سلام کرنا، بڑے کی تکریم اور چھوٹے سے شفقت کا اظہار کرنا ہمارے دینی آداب میں سے ہے جن کا عموماً ان پیغامات میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ۲۔ اردو کو رومن حروف میں لکھنا بہت غلط ، باعث ضرر اور نا قابل قبول ہے اور راقم عموماً ایسے پیغامات نہیں پڑھتا جو رومن اردو میں لکھے گئے ہوں۔ ۳۔ پیغام بھیجنا لیکن اپنا نام نہ لکھنا یا تو بد سلیقگی ہے یا بزدلی اور اخلاقی لحاظ سے دونوں غیر مطلوب ہیں۔
> ۴۔ اختصار میں مبالغہ اکثر مخل فہم اور غلط فہمیوں کا سبب بنتا ہے۔
> اس تمہید کے بعد آیئے اس ماہ کے دو اہم SMS کی طرف جو ہمیں موصول ہوئے۔

ہے۔

سوال و جواب کی نشست کے بعد نماز اور کھانے کا وقفہ ہوا اور تیسرے سیشن میں ایف سی کالج یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے سربراہ پروفیسر شاہد رشید صاحب نے تربیت طلبہ کے اسلامی منہج پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے اس ضمن میں موزوں نصاب ، استاد کے کردار، سکول انتظامیہ کے رویوں اور مناسب ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت کا ذکر کیا۔ ان کے نزدیک جب تک سکول انتظامیہ اور اساتذہ مل کر سکول کا ماحول نہ بدلیں اور اسے تربیت فرینڈلی نہ بنائیں طلبہ میں تبدیلی لانا مشکل ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں والدین کے کردار کو اہمیت دیتے ہوئے سکول پرنسپلز کو مشورہ دیا کہ وہ بچے کی تربیت کے حوالے سے والدین سے گہرا رابطہ رکھیں اور ان کے بچے کی اخلاقی تربیت کے معاملات ان سے شیئر کریں۔

اس کے بعد تربیت کے حوالے سے شرکاء نے بحث میں حصہ لیا اور اپنے اپنے تجربات لوگوں سے شیئر کیے۔ شان اسلام ارقم سکول لاہور کے ظفر جمال بلوچ صاحب ، مصعب سکول لاہور کے پرنسپل محمد اسحق صاحب، پائنیر ہائی سکول واہ سے محمد سلیم صاحب، منیب پبلک سکول نارووال کے محمد اطہر صاحب اور دیگر ساتھیوں نے اپنے اپنے ادارے کی تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تربیت پر اپنی کتاب کے حوالے سے مختلف تربیتی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر تعلیمی ادارے میں تربیتی نیٹ ورک ہونا چاہیے تا کہ تربیتی سرگرمیوں کو منظم کیا جاسکے۔ ہر طالب علم کی فائل بنائی جائے جس میں اس کی اخلاقی حالت کا اندراج کیا جائے اور تربیت کی سالانہ جانچ (evaluation) کا نظام وضع کیا جائے۔

پروفیسر رشید احمد انگوی صاحب، ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صاحب، پروفیسر سید وقار علی صاحب اور پروفیسر ارشد جاوید صاحب نے بھی کانفرنس کے مختلف سیشنز میں اپنے ماہرانہ خیالات کا اظہار کیا۔

فیصلے

تربیتی نشست کے بعد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تجویز پیش کی کہ اِس تعلیمی کانفرنس کو اسلامی سکولوں میں رابطے کا مستقل ذریعہ بننا چاہیے تاکہ بات محض نشستند وگفتند وبرخاستند تک ہی محدود نہ رہے۔اس پر شرکاء نے باہمی غور وخوض سے مندرجہ ذیل فیصلے کیے:

۔ اس طرح کی کانفرنس ہر چند ماہ بعد ہوتے رہنی چاہیے۔

۔ سب اداروں کو ماہنامہ البرہان بھیجا جائے اور اس کانفرنس کی روداد شائع کی جائے۔

۔ Network of Islamic Schools (NIS) یا اسی طرح کے کسی نام سے ابتداءً ایک ڈھیلا ڈھالا نظام وضع کیا جائے جس کا دائرہ کار ٹریڈ یونین سرگرمیاں نہ ہوں بلکہ اس کے پیش نظر رکن تعلیمی اداروں کی علمی و تعلیمی ترقی ہو۔صفاء انسٹی ٹیوٹ اس سلسلے میں مرکز اور رابطے کا کردار ادا کرے۔

۔ شریک اداروں کی ڈائریکٹری شائع کی جائے۔

۔ اکثر شرکاء نے پاکستانی تعلیم میں بڑھتی ہوئی مغربیت پر تشویش کا اظہار کیا لیکن اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ تعلیمی اداروں سے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے لہٰذا ایسی حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے جس سے مغربی فکر وتہذیب کے سیلاب کو اس طرح روکا جائے کہ اس سے لوگوں کو مالی ابتلا کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۔ شرکاء کانفرنس نے دو قراردادیں پاس کیں۔ ایک میں کہا گیا تھا کہ تعلیم خصوصاً نصابیات کا شعبہ مرکز کے پاس رہنا چاہیے اور صوبائی خودمختاری کے نام پر صوبوں کے حوالے نہیں کیا جانا چاہیے تاکہ قومی یک جہتی کو نقصان نہ پہنچے۔ دوسری قرارداد میں پنجاب حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کو پہلی جماعت سے لازمی کرنے اور اسے پانچویں اور آٹھویں کے امتحان کے لیے واحد ذریعۂ اظہار قرار نہ دیا جائے اور قرآن حکیم وعربی زبان کو اختیاری نہ قرار دیا جائے۔

آخر میں شرکاء میں اسناد تقسیم کی گئیں اور دعاء پر کانفرنس کا خاتمہ ہوا۔

تعارفِ کتاب

انجینئر مختار فاروقی ☆

Slouching Towards Gomorrah

Modern Liberalism and American Decline

(عمل قوم لوطؑ کی وجہ سے امریکی معاشرہ زوال کی راہ پر گامزن ہے)

آج کے ترقی یافتہ مغربی معاشرے کا سرخیل بجا طور پر امریکہ ہے جو ۱۷۷۶ء سے بعد کی مسلسل جدوجہد کے بعد آج اس مقام پر پہنچا ہے۔ اس کا نعرہ پہلے دن سے ہی سیکولرزم "Ordo Novo Seclorum" یعنی استرداد مذہب تھا جو ایک ڈالر کے امریکی نوٹ پر مسلسل طبع ہو رہا ہے۔ یہ معاشرہ آج حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اعمال کا وارث ہے۔ کئی امریکی ریاستوں میں دو مردوں کی شادی کے قانون کے پھریرے اڑاتا، یورپ اور بھارت میں اپنی کامیابیوں پر اتراتا۔۔۔ حالیہ دنوں میں امریکی سفارت خانہ اسلام آباد کے زیر انتظام اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قومِ لوطؑ کے سے اعمال کے پرستاروں کا اجتماع منعقد کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

آج کا امریکی معاشرہ جدید لبرل ازم کی جس شاہراہ پر گامزن ہے اسی کو ۱۹۹۸ء میں ایک امریکی سکالر فوکویاما نے *"End of HIstory and the Last Man"* کا نام دیا تھا گویا جو آزادیاں عوام کو آج امریکہ میں حاصل ہیں اس سے زیادہ آزادی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے اور ۱۹۹۸ء ہی میں امریکی اعلیٰ عدالت کے ایک ریٹائرڈ جج رابرٹ ایچ بارک نے امریکی معاشرے کی ایک متضاد تصویر پیش کرتے ہوئے اسے زوال کی طرف گامزن قرار دیا تھا۔

تقریباً چارسو صفحات کی یہ کتاب نیو یارک ٹائمز نے شائع کی تھی اور یہ Best Seller کا اعزاز حاصل کرنے والی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے امریکی معاشرے کی یہ کیفیت بیان کی ہے کہ یہ گزشتہ تین عشروں سے قوم لوطؑ کی راہ پر بگٹٹ دوڑا جا رہا ہے اور اب قومِ لوطؑ کے انجام (یعنی عذاب الٰہی) کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مصنف کا تجزیہ اس اسلامی اصول کی حقانیت کو بالواسطہ طور پر اجاگر اور ثابت کرتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار مادی وسائل سے زیادہ ان کے اخلاق پر ہوتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے قابل ہے افسوس کہ امریکی یاترا کرنے والے اور امریکی معاشرے کے گن گانے والے اس معاشرہ کے بارے میں ایسی حقیقت پسندانہ اور چشم کشا باتیں۔۔۔ یا تو جانتے ہی نہیں۔۔۔ یا جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تب بھی افسوس ناک اور اگر دوسری صورت ہے تب اس سے بھی زیادہ قابل افسوس اور قابلِ رحم۔ اس کتاب کے بہت سے حصے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

مدیر کے نام

مکی اور مدنی زندگی کی جدوجہد

"تمہیں یہ شکایت ہے کہ نوجوان تمہارے پروگراموں میں نہیں آتے، تمہاری بات نہیں سنتے! وجہ یہ ہے کہ تم مکہ کے نبی ﷺ کی شان کے وارث تو ہو لیکن اگر تم مدینہ کے نبی ﷺ کی شان کے بھی وارث بن جاؤ تو تم دیکھو گے کہ نوجوان تمہاری طرف جوق در جوق آئیں گے۔"

(موبائل 0315-6737577)

البرہان: بھائی! آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ہم الحمدللہ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی کو اسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں خواہ وہ مکی زندگی ہو یا مدنی۔ ہمارے نزدیک مکی زندگی کی دعوت و اصلاح اور تربیت و تزکیہ (انسان سازی) بھی ضروری ہے اور مدنی زندگی کا قیام اسلامی معاشرہ وریاست بھی۔ البتہ اس معاملے کی تفہیم اور اس سے استنباط مسائل میں بعض لوگوں/گروہوں نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے جس سے کئی غلطیاں اور غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ بعض لوگ مکی زندگی (تعلیم و تربیت اور دعوت و اصلاح) کو بنیادی اہمیت دے کر مدنی زندگی (قیام اسلامی معاشرہ وریاست) سے صَرفِ نظر کرتے ہیں جو بداہتاً غلط ہے۔

۲۔ اس کے برعکس بعض لوگ مدنی زندگی (قیام اسلامی معاشرہ وریاست) کو اصل کام سمجھ کر مکی زندگی کے اصولوں سے صَرفِ نظر کرتے ہیں اور یہ بھی صراحتاً غلط ہے کیونکہ دوسرا مرحلہ زمانی، اصولی اور منطقی لحاظ سے مبنی ہے پہلے مرحلے کی جدوجہد پر۔

۳۔ بعض لوگ آج کے حالات کو عہد نبوی پر قیاس کرتے ہیں اور دعوت و اصلاح یا قیام اسلامی معاشرہ وریاست کے بارے میں اپنے مؤقف کو نبوی منہاج کی پیروی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ قیاس مع الفاروق ہے۔ غور فرمایئے کہ نبی کریم ﷺ نے:

i۔ دعوت کا آغاز دعوئ نبوت سے کیا۔ ii۔آپ ﷺ کے مخاطب کفار تھے۔ iii۔آپ ﷺ نے اسلامی معاشرہ اور ریاست قائم کرنے کے لیے دعوت و اصلاح کے علاوہ جہاد و قتال سے بھی کام لیا۔

جب کہ آج کے معاشرے میں: i۔علماء اور مصلحین کسی دعویٰ سے کارِ دعوت و اصلاح کا آغاز